انتخاب
مضامین پطرس

مرتبہ

وجاہت علی سندیلوی

اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات: ۱۷۹

انتخاب
مضامین پطرس

مُرتّبہ
وجاہت علی سندیلوی

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

انتخاب مضامین پطرس

مرتبہ / وجاہت علی سندیلوی

سنہ اشاعت : ۱۹۸۴

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت : آٹھ روپے

ستیش چندر سریواستو، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس نشاط پریس ٹانڈہ (فیض آباد)
سے چھپوا کر اکادمی کے دفتر بلہرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ سے شائع کی۔

پیش لفظ

اتر پردیش اردو اکادمی کا ادبی انتخاب کا سلسلہ خاصا مقبول ہو رہا ہے، آج کی مصروف زندگی میں ضخیم کتابوں تک رسائی اور ان کے تفصیلی مطالعے کا وقت عام قاری کے پاس نہیں ہے۔ انتخابات میں جو فاضل مرتبوں سے تیار کرائے جاتے ہیں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ تمام چیزیں آجائیں جو کسی مصنف کا طرۂ امتیاز ہیں اور اس کی شناخت کا جن پر دارومدار ہے۔

احمد شاہ بخاری پطرس اردو کے ایسے مزاح نگار ہیں جو کمیت کے لحاظ سے مختصر سرمایہ رکھتے ہیں لیکن کیفیت کے پہلو سے ان کی تخلیقات عالمی معیار پر پوری اترتی ہیں۔ زیر نظر انتخاب میں خالص مزاح نگار کے علاوہ ادب کے سنجیدہ پارکھ اور مبصر کی حیثیت سے بھی پطرس کی تصویر اُبھرتی ہے۔

پطرس کی تحریروں کا یہ انتخاب اکادمی کی درخواست پر جناب وجاہت علی سندیلوی نے کیا ہے۔ وجاہت صاحب خود بھی معروف مزاح نگار ہیں اور اردو کے ادبی سرمایے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اکادمی اس زحمت کے لیے ان کی ممنون ہے۔

امید ہے اس کتاب کو قارئین میں مقبولیت حاصل ہوگی۔

محمد رضا انصاری

(چیرمین)

اتر پردیش اردو اکادمی،
لکھنؤ

ترتیب

تعارف

اصلی نام: سید احمد شاہ بخاری

قلمی نام: پطرس

والد کا نام: سید اسد اللہ شاہ

تاریخ پیدائش: یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء (پشاور)

تاریخ وفات: ۵ر دسمبر ۱۹۵۸ء (نیویارک)

تعلیم: بی۔اے ( ) ایم۔اے (انگریزی ادب)

عہدے: گورنمنٹ کالج لاہور میں ادبیات کے پروفیسر کئی سال تک رہے اسی اثنا میں

پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کے بھی سکریٹری ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک رہے۔

۱۹۳۷ء سے ڈپٹی کنٹرولر اور ۱۹۴۰ء سے کنٹرولر جنرل آل انڈیا ریڈیو۔

۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

۱۹۴۹ء سے مجلس اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے سربراہ مقرر ہوئے۔

۱۹۵۵ء میں اقوام متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کے ڈپٹی سکریٹری جنرل مقرر ہوئے۔

اور اسی عہدے کے زمانے میں انتقال ہوا۔

تصانیف: پطرس کے مضامین ۱۹۲۸ء ۔ دیہات میں بوائے اسکاوٗٹ (ترجمہ) ۱۹۳۴ء

تعلیم خصوصاً اوائل طفلی میں (برٹرنڈ رسل کی تصنیف کا ترجمہ) ۱۹۳۵ء
نوع انسان کی کہانی (ترجمہ) ۱۹۳۹ء ڈرامہ اور تھیٹر پر بہت سے
مضامین، کئی کتابوں کے دیباچے۔ کئی کتابوں پر تبصرے۔ بہت سے
متفرق مضامین انگریزی اور اردو میں۔ کئی انگریزی افسانوں اور ڈراموں
کے ترجمے۔

متفرق: پطرس کو انگریزی ادب پر بڑا ہمہ گیر عبور حاصل تھا۔ اردو ہی کی طرح وہ
انگریزی کے بھی ایک بلند پایہ انشا پرداز تھے۔ بلا کے ذہین، درّاک اور
حاضر دماغ تھے۔ دوستوں کو جمع کر کے باتیں کرنا ان کا محبوب ترین مشغلہ
تھا۔ بہت ہی دلچسپ اور پُر لطف باتیں کرتے۔ ان کی برجستہ گوئی کے
بیسیوں لطیفے مشہور ہیں۔

پطرس کے مضامین

بلاشبہ پطرس کے مضامین، اردو کی مقبول ترین تصانیف میں سے ایک ہے۔ اردو کی کتابوں کا کیسا بھی سخت سے سخت ترین انتخاب کیا جائے، دیوانِ غالب ہی کی طرح پطرس کے مضامین کا اُس میں شامل کیا جانا ناگزیر ہوگا۔ اور یہ بھی ایک دلچسپ لیکن غور طلب حُسنِ اتفاق ہے کہ یہ دونوں ہی اردو کی بہت مختصر کتابوں میں سے ہیں۔

پروفیسر احمد شاہ بخاری نے پطرس کے تمثیلی نام سے ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان اپنی جو فکاہیہ تخلیقات، مخزن، نیرنگ خیال اور لاہور کے دوسرے رسالوں اور جریدوں میں پیش کی تھیں اُن کا مجموعہ پطرس کے مضامین، جس میں صرف گیارہ مضامین تھے۔ پہلے پہل ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ چھوٹے سائز کے شکل سے صرف ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے لیکن اسے فوراً ہی جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور اس نے جس طرح عوام اور خواص کو اپنی ذہنی گرفت میں لے لیا، اُس سے اِسے بجا طور پر ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں صحیفہ کہا جا سکتا ہے۔

پطرس کے ادبی ورُود سے قبل ہمارے اردو ادب میں جس طنز و

مزاح کا سکہ چلتا وہ الفاظ کے محل استعمال یا اُن کی اُلٹ پھیر یا صرف پھبتی،
فقرہ بازی یا بگڑے رئیسوں، شیخی خوروں یا پھر مضحک کرداروں کی الٹی
سیدھی حرکتوں یا حماقتوں پر مشتمل تھا اور گو کہ اس زمانے میں بھی ایک
سے بڑھ کر ایک مزاح نگاری کے شہ پارے پیش کیے گئے لیکن مزاحیہ
تخلیقات کے متعلق عموماً اہل قلم بقول شخصے گدگدیوں میں زیادہ گرہ ڈالنے
کے قائل تھے اور ہمارے فکاہیہ ادب کا جھکاؤ سنجیدہ مزاح سے کہیں
زیادہ پھکڑپن کی جانب تھا۔ اس میں معاشرے کے مروجہ مذاق کا بھی بڑا
دخل تھا اور یہ دور ایک ایسی ارتقائی مرحلے کی بھی نشان دہی کرتا ہے
جس سے قریب قریب ہر زبان کے مزاحیہ ادب کو کسی نہ کسی زمانے میں
گزرنا پڑتا ہے۔

ایک انگریزی ادبیات کے پروفیسر کی حیثیت سے انگریزی کے انداز
اور اسالیب پطرس کے ذہن میں رچے اور بسے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے
مزاح کی اساس زندہ دلی، خوش طبعی، شوخی اور بہت لطیف شعورِ مزاح
پر رکھی ہے۔ وہ کسی دوسرے کا حلیہ بگاڑ کر اُس کو اپنے مذاق کا ہدف
نہیں بناتے بلکہ خود اپنے آپ (واحد متکلم) پر بیتے ہوئے تجربات اور حادثات
کو اس درجہ سادگی اور پرکاری سے بیان کرتے ہیں جیسے اُن میں ہنسنے
ہنسانے کی کوئی بات ہی نہ ہو لیکن قاری اُن کی اسی ادا پر لوٹ پوٹ
ہو جاتا ہے۔ اُن کے موضوعات میں کوئی خاص ندرت نہیں پائی جاتی۔
لیکن اُن کی ذہانت کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف اپنے اندازِ بیان سے معمولی کو
غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ ان کے اسلوبِ نگارش میں صرف آمد ہی آمد ہے اور
کہیں آورد یا تصنع کا کوئی شائبہ تک نہیں ملتا۔ وہ اگر کبھی نوجوانی کے کھلنڈرے پن
تک بھی پہنچ جاتے ہیں تو وہ اتنا بے ساختہ اور فطری ہوتا ہے کہ قاری خود اپنے

آپ کو اس میں شریک پاتا ہے۔ وہ اپنے خاکوں اور مزاحیہ افسانوں کا تانا بانا پہلے سے سوچے سمجھے مضحک واقعات سے بناتے ہیں اور صرف الفاظ کے تو تا مینا بنانے سے احتراز کرتے ہیں۔ وہ اپنے مزاح کو کسی قسم کی تنقید یا اصلاح کے جذبے سے بوجھل نہیں بناتے لیکن قدم قدم پر اُن کے چبھتے ہوئے فقرے دعوت فکر دیتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے بجا طور فرمایا ہے کہ پطرس کا ہمسر اُن کے ہمعصروں میں کوئی نہیں ہے۔

اکثر وقیع تنقید نگاروں نے جن میں آل احمد سرور بھی ہیں پطرس کے بہت قلیل ادبی سرمایے کی بنا پر اُنھیں کسی بڑے ادبی منصب کا حق دار نہیں سمجھا ہے۔ اُن کے پہلے اور آخری مزاحیہ مجموعے میں جو گیارہ مضامین ہیں اُن میں کم سے کم چار جیسے، میں ایک میاں ہوں، انجام بخیر، سینما کا عشق اور میبل اور میں یقیناً قدر اول کی چیزیں نہیں کہی جا سکتیں۔ پطرس کو اپنے ہم عصروں پر جو ایک امتیازی فوقیت حاصل ہے اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہم عصروں کے اکثر اور بیشتر شاہ کار بسیار نویسی کے انبار میں گم ہو چکے ہیں۔

یہ ایک بڑی حیرت کی بات ہے کہ پطرس کے مضامین، جب پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئے تھے تو اُنھیں فوراً ہی قابل رشک ہر دل عزیزی حاصل ہو گئی تھی اور اس وقت کے مقبول ترین مزاح نگاروں نے پطرس کو اپنا پیش امام تسلیم کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود پطرس دسمبر ۱۹۵۸ء، اپنے انتقال کے وقت تک ان مضامین میں کوئی اضافہ نہیں کر سکے۔ کچھ فکاہیہ مضامین پطرس نے ۱۹۲۸ء کے بعد بھی وقتاً فوقتاً لکھے جن میں جو دستیاب ہو سکے وہ اس مجموعے میں شامل بھی کیے جا رہے ہیں، لیکن وہ پطرس کے مضامین کے ہم پلہ ہرگز نہیں کہے جا سکتے اور ان میں ان کا قد بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۵۸ء کی درمیانی تیس سال کی طویل مدت میں پطرس نے کچھ لکھا ہی نہ ہو انھوں نے اس عرصے میں سیکڑوں

صفحات کے متفرق مضامین اور ترجموں کے علاوہ ۴۰۰ صفحات کی تعلیم خصوصاً اوائل طفلی میں (ترجمہ) صفحات کی دیہات میں بوائے اسکاؤٹ (ترجمہ) اور ۲۰۰ صفحات کی نوعِ انساں کی کہانی (ترجمہ) اور قریب ۵۰۰ صفحات ڈرامے، تھیٹر، اداکاری اور فلم سازی کے موضوعات پر لکھے۔

مزاح نگاری میں پطرس کی ۱۹۲۸ء کے بعد کم سخنی یا بے سخنی، یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتی ہے کہ مزاح نگاری ان کا صرف شوق تھا فن نہیں۔ وہ اس کے لیے کوئی ریاضت کرنے یا مشقت اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے اور یا پھر اپنی دوسری مصروفیتوں یا کثرتِ کار کی وجہ سے اس 'شیشہ گری' کے فن کے سوتے اُن کے لیے خشک ہو گئے تھے اور انھوں نے ایک نووارد کے جوش اور جذبے میں اپنی پہلی ہی جست میں جن بلندیوں کو چھو لیا تھا ان کو دوبارہ باوجود کوشش پھر نہیں چھو سکے تھے۔ یہی بہت غنیمت ہے کہ انھوں نے اپنی حاصل کی ہوئی شہرت اور عزت کو بسیار نویسی پر قربان نہیں کیا۔

پطرس کی طنزیہ تنقیدیں بڑی جارحانہ اور بے پناہ ہوتیں۔ اس مجموعے میں ان کی دو ایسی تنقیدیں غنچۂ تبسم کے دیباچوں پر ایک نظر اور انارکلی، مخلص صاحب اور ہم نیاز مند (جو بقول محمد طفیل اڈیٹر 'نقوش' لاہور پطرس نے 'نیاز مندان لاہور' کے نمائشی نام سے لکھی تھیں، اور جن میں انداز قد سے بھی پطرس صاف پہچانے جاتے ہیں) شامل کی جا رہی ہیں۔ ان دونوں میں پطرس اپنی بے پناہ مزاحیہ اور طنزیہ صلاحیتوں کے ساتھ پورے جوش وخروش سے جلوہ گر نظر آتے ہیں اور ہمیں ان سے پطرس کی ادبی قد و قامت کا بھی ایک ہلکا سا اندازہ ہو جاتا ہے۔ پطرس کا حقیقی میدان غالباً یہی تھا۔ ان مضامین کو پڑھ کر ہمیں پطرس سے بجا طور پر یہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ جس فن کار کی جنبشِ قلم سے ہمارے ادب پر سیکڑوں خزاں ناآشنا بہاریں چھا سکتی تھیں اُس نے ہمیں صرف چند کلیاں ہی دے کر اپنا ہاتھ کیوں روک لیا۔

وجاہت علی سندیلوی

نصرت منزل۔ سندیلہ

۲۵ جون ۶۸ء

اظہار عقیدت

میں اپنے استاد محترم پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا۔

میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی اُن سے فیض تلمذ حاصل ہے۔

پطرس

پطرس کے مضامین پر پطرس کا دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے، اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے۔ تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں۔ حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بھی "ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں" آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں۔ وہ پہلے اُس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کرلیں۔

"پطرس"

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی۔ اور رفتہ رفتہ بی۔ اے بھی پاس کر لیا۔ لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا؟ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لیے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی۔ اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے۔ دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس لیے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً ان رشتہ داروں کے لیے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے۔ فخر و مباہات کا باعث بن گیا اور "مرکزی رشتہ داروں" نے تو اس کو پاس وضع داری اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے انتہا سراہا بہر حال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔ اس لیے بلا تکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانبدار

اور ایمان دار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیس دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹوگرافی تصنیف و تالیف، دنداں سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام، غرضیکہ بیشمار مفید اور کم خرچ بالا نشین پیشے سیکھے جا سکتے ہیں اور تھوڑے عرصہ کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا کیونکہ ولایت بھیجنے کے لیے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لیے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے نہ طلب کی گئی۔ اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیل دار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے، جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی لیکن جب اِدھر اُدھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سننے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت یہ ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیحد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی لیکن ایک مناسب حد تک۔ تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیل دار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے۔ تو بہت خوب تھا لیکن انھوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر یا کسی کے اور

طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے ایک تو وہ چرب زبان. اس پر انھوں نے بے شمار غلط بیانوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہوسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے۔ اور جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے۔ تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالے میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا کسی جوئے خانہ میں ہزار ہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا پھر فرسٹ ایر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک۔ مگر یہ ناممکن۔ جب انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے۔ جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوص کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے۔ اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا۔ وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے یہ سوچا یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا۔ اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں اس صحبت میں، میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا؟ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا کیوں کہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ "ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو۔ جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا

پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں؟ ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں ایک بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ اگرچہ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ زندگی میں ایک آزادی ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہیئے۔ وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں۔ کس وقت باہر جاتے ہیں؟ کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی؟ کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ناممکن ہے؟ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جاسکتا ہے کون سا ملازم موافق ہے؟ کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کرلیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی ہم نے دل سے کہا "والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا۔ ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا۔ ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔"

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں میں وطن کو واپس گیا۔ تو چند مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کئے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بیچارا ہاسٹل کو واپس آرہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آگئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر

اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سُن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا۔ کہ ایک دفعہ شامتِ اعمال بیچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کے بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اُسے عمر بھر کو سینما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیے تھا۔

انھیں ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر آئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی سی آ گئی تھی پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں۔ وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کی ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلبا کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ جانتا ہے کہ "والدینی اغراض" کے لیے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے بعض روشن خیال بیٹے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے ہاسٹل میں پڑھنا

نام منی آرڈر پر منی آرڈر چلا آتا ہے ے

بناداں آنچناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا۔

"تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے؟"

میں تو خود اسے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا۔ دیکھئے نا! مثلاً ایک طالب علم ہے وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے۔ ایک اس کا جسم ہے جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔ جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے۔ نہ دماغ سے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی شخصیت نہ خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے لیکن پھر بھی اگر ہو بھی۔ تو بھی۔ گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے۔ ٹھہریئے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔" ایک منٹ کے بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہیئے۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا والد کہنے لگے۔

کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟

میں نے کہا "چال چلن ہی کہہ لیجئے۔"

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے؟"

میں نے نسبتاً نحیف آواز سے کہا "جی ہاں۔"

"یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں، ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ سچ زیادہ بولتے ہیں، نیک زیادہ ہوتے ہیں۔

میں نے کہا "جی ہاں۔"

کہنے لگے "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اے کاش، میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گذر جائیں گے دن" گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔ نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقع زیادہ ملتے رہتے ہیں اور ان "بیرون از کالج" ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لیے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں، تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس سے رسوخ بڑھتا ہے لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا۔ معقولیت کم ہوتی گئی شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے یک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگایئے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی

ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار رجحانات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہوگیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔ اے کا امتحان دیا تو فیل ہوگیا اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی قصہ ہوا۔ تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دل چسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔ اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آگیا تھا۔ لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلے جیسی وقعت اب نہ رہی تھی۔

میں زمانہ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ اس سے ایک تو آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ا ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی۔ اے میں کیوں فیل ہوا؟ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔ اے کا امتحان دیا تو چوں کہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا۔ اس لیے ہم اس میں "کچھ" پاس ہی ہو گئے۔ بہر حال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو۔ ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کیا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بغیر رضا مندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر کوئی اس میں سفر کر رہے ہوں۔ نقل نویسی کی سخت ممانعت)۔

اب جب ہم بی۔ اے میں داخل ہونے لگے۔ تو ہم نے یہ سوچا کہ بی۔ اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لیے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے۔ چنانچہ بی۔ اے میں ہمارے مضامین انگریزی تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حالات پیدا ہوئی۔ اس کا

ہاسٹل میں پڑھنا

اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوت مطالعہ منتشر ہوگئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کے بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا۔ وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔ آپ یقین مانیے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا۔ اور فرض کیا۔ اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا۔ بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لیے وقف کر دیتا۔ تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر بھی کما حقہٗ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا لیکن بی۔ اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا کیوں کہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچے نا کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا۔ وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا۔ بلکہ اس کی بجائے۔ مگر خیر یہ بات بھی پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لیے از حد حیرت کا موجب ہو اور سچ پوچھیے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے۔ اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔ اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو۔ مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی باید و شاید۔ باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں

لیکن جتنا غور کیا۔ اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا نی الحال مشکل ہے۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں:۔

(۱) انگریزی۔ تاریخ۔ فارسی۔

(۲) انگریزی۔ تاریخ۔

(۳) انگریزی۔ فارسی۔

(۴) تاریخ۔ فارسی

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کیا۔

(۵) تاریخ میں فیل۔

(۶) انگریزی میں فیل۔

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں۔ لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ ازحد جانکاہ ہوگا لیکن اس میں مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بیتابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار در اصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا۔ بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لیے بی۔ اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا۔ تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ

ہاسٹل میں پڑھنا

وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ ہی تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے میں پرچوں میں کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اکثر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انھیں صدمہ نہ ہو لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا لیکن اِدھر اُدھر کے لوگ "اجی نہیں صاحب" "اجی کیا کہہ رہے ہو!" "اجی یہ بھی کوئی بات ہے"۔ ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہرحال اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی تھی کہ بس یہ دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہو گی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا ہم قصہ شروع کرنا چاہیے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں۔ اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے۔ تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال صرف ایک سال اور یہ آخری موقعہ ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا۔ ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو آپ ضرور ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلباء کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و

ہاسٹل میں پڑھنا

خوض میں تبدیل ہو گیا لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہوا کہنے لگے "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحر علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے ہر ہاسٹل میں دو دو سو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے کھانے کے کمرے میں۔ کامن روم میں غسل خانوں میں۔ برآمدوں میں۔ ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے وہ دن رات آپس میں شکسپیر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلباء اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلباء رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ.......

والد نے اجازت دے دی

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں۔ اور کب اگلے سال کے لیے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی۔ اور انہیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لیے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کیوں کہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لیے ہوسٹل میں آ رہے ہیں۔ جس سے ہم طلباء کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی۔ جس کے ارد گرد ناتجربہ کار طلباء مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے۔ تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے اور فلاں فلاں قواعد سے اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھیے کہ جب نتیجہ نکلا۔ تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمایئے۔ کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

○

سویرے جو کل میری آنکھ کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں۔ ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے۔ لفظوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی اُنھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر جاگیں گے۔ تو لاحول پڑھ لیں گے لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا۔ اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر ریپنڈولم کی طرح ہلنے لگا۔ تو بیداری کا قائل ہونا پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں ......" اچھا! ...... اچھا! ...... تھینک یو! ...... جاگ گیا ہوں ...... بہت اچھا! نوازش ہے!" آنجناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں خدایا کس آفت کا سامنا ہے! یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مُردے کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے؟ پیشتر اس کے بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے

ہں! سوچا کہ آج پتہ چلائیں گے۔ یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشن دان میں سے چاروں طرف دیکھا۔ اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو، کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی۔ "لالہ جی!...... لالہ جی۔

جواب آیا۔ "ہوں"۔

میں نے کہا "آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا سا ہے؟"

کہنے لگے۔ "تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟"

تین بجے کا نام سُن کر ہوش گم ہو گئے یہ چونک کر پوچھا "کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں؟

کہنے لگے "تین...... تو...... نہیں...... کچھ سات...... ساڑھے سات.... منٹ اوپر تین ہیں۔"

میں نے کہا "ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا۔ یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے تین بجے اٹھ کے ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں، کوئی مذاق ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و شدد کو خیرباد کہہ دوں لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کا اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض لمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اُٹھے۔ بارہ بجے تک منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوش شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت ہو بھی نہایت لطیف تھی طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر"۔

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے پس انگلیاں وہیں پر رک گئیں۔ اور کان آواز طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)۔

ہم نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں لیکن خیر فرمایئے؟"

"بولے "ذرا....... وہ....... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں"

بس صاحب۔ ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی۔ فوراً مر گئی۔ دل نے کہا "او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں" صاحب۔ خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آبیٹھے۔ دانت بھینچ لیے۔ نکٹائی کھول دی۔ آستینیں چڑھالیں لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سُرخ۔ سبز زرد بھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵ اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے؟ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے۔ کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغو بات ہے۔ البتہ پانچ۔ چھ۔ سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیئے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے۔ بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوت ارادی کافی زبردست ہے۔ جب چاہیں اُٹھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی۔ "لالہ جی!"

انھوں نے پھر کھینچ مارا۔ "بس!"

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ "لالہ جی" صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں......"

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا۔ "جب چھ بج چکیں تو...... سُنا آپ نے؟" "چپ۔"

"لالہ جی!"

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ "سُن لیا سُن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما بس فوراً ایلفا پلس......"

ہم نے کہا: "ب۔ب۔ب بہت اچھا۔ یہ بات ہے۔"

توبہ۔ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک دو منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہرصورت جیسا کہ میرا فرض تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اسے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے۔ اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت پڑھا پھر یہ بھی یاد ہے کہ اُٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا نہیں پتہ۔ شاید لحاف اوپر سے اُتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ یا شاید کھانسا کہ خدا جانے خرّاٹا لیا؟ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے نہیں ہمارا خیال پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ؟ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس میں سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

چھ دیر میں بجے ہوں؟ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا۔ اور اپنے آپ کو ستاتا رہا۔ مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔ حد درجے کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا۔ ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اُٹھتا۔ "لالہ جی۔ صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے یعنی اگر صبح کی بجائے صبح صبح شام ہوا کرتی۔ تو دن کیا بُری طرح کٹا کرتا۔"

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے۔

"تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟"

میں نے کہا "ہاں، ہاں! واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بے شک۔"

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا۔ اوور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے۔ دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیت الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو "گڈ مارننگ" کیا اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے نئی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اُٹھے۔ دل سے کہا کہ "دل بھیا۔ صبح اُٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یونہی اس سے ڈرا کرتے تھے"۔ دل نے کہا "اور کیا؟ تمہارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں"۔ ہم نے کہا "سچ کہتے ہو یار یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں۔ تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں؟ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ

رہے ہیں بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔" ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اُسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا۔ اور پھر سوچنے لگے..... "خوب۔ تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بیچارا بھی کہتا کہتا مر گیا۔ لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی....." (لحاف کانوں پر سرک آیا)

......تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں....... بہت ہی پہلے..... یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے...... کیا بات ہے! خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیئے سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے..... (لحاف سر پر) ...... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے..... (آنکھیں بند)..... تو اب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں شیکسپیئر یا ورڈز ورتھ؟ میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہوگا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں! اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟" پھر خیال آیا "دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈز ورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا۔ اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے لیکن شیکسپیئر... نہیں ورڈز ورتھ ہی ٹھیک رہے گا..... ہملٹ..... لیکن ورڈز ورتھ..... لیڈی میکبتھ...... دیوانگی..... سبزہ زار...... سنجر سنجر..... بادِ بہاری صید ہوس..... کشمیر..... میں آفت کا پرکالہ ہوں....."

یہ معمّہ اب فلسفہ ما الطبیعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈز ورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا۔ تو وہی دس بج رہے تھے۔ اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے!"

کالج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے "مسٹر! صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی۔ آپ نے جواب نہ دیا؟"

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "ادہو! لالہ جی یاہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا"۔

بولے "وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں...... اس کے بعد...... کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی۔ آپ بولے ہی نہیں"۔

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک دو منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔ پھر یکایک ایک مجوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کے کہا "ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں اُس وقت...... ا ے...... ا ے۔ نماز پڑھ رہا تھا۔

لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیئے اور ہم اپنے زہد و اتقا کی سکینی میں سر نیچا کئے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روز مرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز!

جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ "ہمارا فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب ہو" اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُرپیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں۔ اور عشق میں ڈوبی ہوئی سُریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

"تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے۔ اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز تبسم، صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت "سانوری صورت توری من کو بھائی" کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے۔

سویرے... آنکھ کھلی

نصیب یہ ہے۔ کہ پہلے "مسٹر، مسٹر!" کی آواز اور دروازے کی دنا دن سامعہ نوازی کرتی ہے۔ اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گڑویوں کے گر پڑنے۔ دیگچیوں کے الٹ جانے دروازوں کے بند ہونے۔ کتابوں کے جھاڑنے۔ کرسیوں کے گھسیٹنے۔ کلیاں اور غرغر کرنے۔ کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجئے کہ ان سازوں میں سُر تال کی کس قدر گنجائش ہے!

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

کُتّے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آتا۔ کہ آخر کتّوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجیے۔ دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجیے۔ دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتّے کیا کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ کتّا وفادار جانور ہے۔ اب جناب، وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا۔ تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتّے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی۔ تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتّے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بھنّا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتّے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر، آرڈر" پکارا لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمھیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا۔ تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے؟

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتّے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک

کتّے

قابل تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجئے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا خدا کی قسم ان کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی۔ اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری۔ موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر۔ نہ سر نہ پیر۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں۔ بےتالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔ گلے بازی کئے جاتے ہیں گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجئے جو ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیہ گرہ سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو تعلّی سمجھیں لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اُٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہئے کہ دافع بلیات ہے لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں۔ تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے یہ البتہ ٹھیک ہے۔ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کی سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیتہ الکرسی آپ کے ذہن سے اُتر جائے گی۔ اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نومشقی کا عالم بھی ہے۔ اس لیے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سُرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا۔ انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مُڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو۔ آنکھوں نے اُسے بھی کتا دیکھا۔

کتے

کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیر لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا؟ بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفریں رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آ کر کہہ دے کہ عالیجناب سڑک بند ہے۔ تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کیے واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو۔ تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کیے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہو گا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیوجانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا۔ لوگوں سے کہلوایا۔ خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں۔ تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورتِ حالات کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا۔ تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے۔ اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی۔ تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ راستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دُم کو تا بحدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا۔ انھوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی، "بچہ فقیروں کو چھیڑتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے

بیٹھے ہیں۔ بس اس فقیر کی بددعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں۔ اور جانے نہیں دیتے آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں!

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے۔ تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لیے کسولی پہونچ جائیں۔ ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے"۔ یہ بجا سہی۔ لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے؟ اور کاٹنا شروع کر دے!"

اردو کی آخری کتاب

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اُس کے منھ کو تک رہی ہے۔ اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے۔

(۱) وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا۔

(۲) بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

(۳) دولھا کب بنے گا۔ اور دلھن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ہم کب بڈھے ہوں گے؟

(۵) تو کب کمائے گا؟

(۶) آپ کب کھائیے گا؟ اور ہمیں کب کھلائیے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے اور کلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باقی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے۔ تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو تو افیم کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ بچہ نیند میں رونے لگتا ہے۔ تو بیچاری ماں کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ایک اور اُبال دیتی ہے۔ بچہ صبح جب بچہ کی آنکھ کھلتی ہے۔ تو آپ بھی اٹھ بیٹھتی ہے۔ اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منھ دھلاتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے۔ اور جی کڑا کر کے کہتی ہے "کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ واہ۔ واہ۔"

کھانا خود بخود پک رہا ہے

دیکھنا۔ بیوی آپ بیٹھی کھانا پکا رہی ہے۔ ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھلائے برتن صندوق پر چنے ہیں۔ تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے۔ کسی میں آٹا۔ کسی میں چولھے پھکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے۔ تاکہ جب چاہے۔ آگ جلالے۔ جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا گوندھا رکھا ہے۔ چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اُتار کر رکھے ہیں۔ دال چولھے پر چڑھی ہے۔ غرضیکہ سب کام ہو چکا ہے لیکن آپ پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔ میاں جب آتا ہے کھانا لاکر سامنے رکھتی ہے پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھا چکتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے۔ پھر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانے پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو؟ مہاتما گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں۔ آپ ہاتھ پاؤں دبلائے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو بھٹی چڑھاتا ہے۔ دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر۔ تاکہ کپڑوں والے کبھی پکڑ نہ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے۔ صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ اب تک پانی میں کھڑا ہے۔ اسے ضرور سرسام ہو جائے گا۔ درخت کے نیچے بیل بندھا ہے بھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے۔ دریا کے اس پار ایک گلہری دوڑ رہی ہے دھوبی انھیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانا ہاتھ آیا ہے۔ کپڑا پڑے پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ گدھے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کئے۔ اب دھوبن گانا گائے گی دھوبی دریا سے نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر میلا ہو جائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب کہاوت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے۔ دیکھئے! امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں۔ کیا مجال کوئی پاس تو آجائے۔ جو لوگ ایک دفعہ کپڑے دے جائیں پھر واپس نہیں لیجا سکتے۔ میاں دھوبی! تمھارا کام بہت اچھا ہے میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو۔ ننگا پھراتے ہو۔

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ کرنا اصول زندگی سمجھتا ہوں۔ اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اُتنے ہی روشن آرا کو بُرے لگتے ہیں میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ اُنھیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعث ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں۔ جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لے لیجئے۔ اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمۂ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں۔ لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے۔ کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انہی سے جی بہلاتے ہیں ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے۔ تو اُس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے۔ تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی نہیں۔ ہمارے گھر میں "موئے

کبوتر باز" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں کبھی کبھولے سے بھی ہم آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جائیں۔ تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے۔ کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں میری جانب گریز کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا۔ تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا نہیں آتے تم باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لئے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے کیوں بھئی خیر باشد! میں نے کہا کچھ نہیں کہنے لگے۔ اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا۔ اسی لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا۔

"مرزا بھئی! کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے۔ لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کار آمد ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی

جھلک نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اُٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اُٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اُٹھنے میں کوتاہی کریں۔ تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ۔ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے

ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے صابن سر ملتے تھے۔ تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پُراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری ...." اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھا لی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے۔ روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے اور پھر اُس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا؟

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کیے۔ یعنی اب بیشک دوست آئیں۔ بیشک اودھم مچائیں میں بیشک کھاؤں۔ بیشک جب چاہوں اُٹھوں۔ بیشک تھیٹر جاؤں میں نے کہا۔

"روشن آرا جلدی کرو۔ نہیں گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کر چکا تو کہنے لگی۔ "خط ضرور لکھتے رہیے۔" میں نے کہا۔ "ہر روز اور تم بھی!"

"کھانا وقت پر کھا لیا کیجئے۔ اور ہاں دُھلی ہوئی جُرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے

رہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا دل بھی بے تاب ہونے لگا۔ اور جب گاڑی روانہ ہوئی۔ تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کتابوں کی دوکان تک آیا۔ اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہ کر کے جیب میں ڈالا۔ اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے حبشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے۔ تو گو وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں۔ تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگا لیا۔ ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آگیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

"امجد"

"حضور!"

"دیکھو حجام کو جاکے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے۔ تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان آدمی کا نام نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی شطرنج کا کمرہ خالی۔ تاش کا کمرہ خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا

اس سے پوچھا "کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا "حضور! آپ جانتے ہیں۔ اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا۔ کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہونچا۔ معلوم ہوا۔ ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہونچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے۔ "تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا "تھیٹر!"

کہنے لگے "بس بہت ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو میں ابھی آیا۔"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا۔ اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے۔ اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخرکار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پر جمائی جمائی پر جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیا۔ لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا "ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا؟ مردود کہیں کا۔ سارا دن میرا ضائع کر دیا۔"

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بےہوش کر دیا۔

جب آنکھ کھلی۔ تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا۔ اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا۔ اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا "حضور حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا "یہیں بلا لاؤ۔" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوا لیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی۔ جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا۔ تو خدا جانے دل میں کیا خیال آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور سودائیوں کی طرح رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نہ معلوم کیا کیا یاد آیا اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہونچا۔ وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اُداس ہوں۔ تم فوراً آ جاؤ۔"

تار دینے کے بعد دل کو اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی۔ اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لیے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے کریں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں۔ اور پان اس طرح سے متواتر پہونچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا جو کھیل بھی کھیلا گیا۔ بہت معقول طریقے سے۔ قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اڑا نہیں۔ اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑے میں ایک میاں ہوں

لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا۔ جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا۔ دوسرا وزیر تیسرا کوتوال۔ اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سب نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے! ایک بولا" پھر آج جو چور بنا۔ اس کی شامت آجائے گی۔" دوسرے نے کہا اور نہیں تو کیا۔ بھلا ایسا ویسا کھیل ہے۔ سلطنتوں کے معاملے ہیں، سلطنتوں کے!"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائیے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائیے۔" کوئی کہے "نہیں حضور" سب کے پاؤں پڑے۔ اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائیے۔" دوسرے نے کہا۔ نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے ساتھ ناچیے۔" آخر میں بادشاہ سلامت بولے۔" ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے۔ اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا۔ "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے واہ، واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا۔ تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی۔ اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے۔ اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی منہ سے برقعہ الٹا۔ تو روشن آرا۔

دم خشک ہو گیا بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آجاؤ۔ میں بہت اداس ہوں۔ اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے۔ سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں۔ اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آ رہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی...... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہونچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود ازحد شریف واقع ہوا ہوں جہاں تک میں، میں ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے۔ اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے۔ لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے اس لیے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا۔ یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکیے یا حجام کے۔ اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"خط ہے؟"

"جی ہاں۔"

"دے جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

"ناخن تراش دو۔"

"بھاگ جاؤ!"

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا۔ آپ دیکھیے تو سہی!"

مرید پور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں۔ تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہ ہوئی تھی وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے اور میں تو اس کے نزدیک بس علم و فن کا ایک دیوتا ہوں یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے میں نے شائستہ سے شائستہ دودمانوں کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا ہے کہ ان پر تیخ ذات کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں میں موجود تھا وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کر چکا ہوں اور اب بھی بابانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں۔ کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا بعض لوگوں کو یہ شک ہے

کہ میں نے محض اپنی تسکین نخوت کے لیے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرا لیا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدطینتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ دو ایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے۔ لیکن کانگریس کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا۔

جب کانگریس کا جلسۂ سالانہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متقی ہوگا جو وہاں جانے سے گریز کرے؟ زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا۔ چنانچہ میں نے شغل بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سُنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا۔ رات کو گھر آ کر اس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا کہ سند رہے۔ اور وقت ضرورت کام آوے۔

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بیحد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے۔ بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے۔ خط کو خود پڑھتے۔ پھر دوستوں کو سناتے پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دوکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے پھر مقامی اخبار کے بیحد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے۔ جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام مرید پور گزٹ ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں۔ دو مہینے تک جاری رہا۔ پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسب ذیل ہے۔

رنگ گندمی۔ گفتگو فلسفیانہ۔ شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر اپنا ایک کانگریس نمبر بھی نکال مارا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔ بہرحال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت انشا پردازی، صحیح الدماغی اور جوش قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھے مرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا۔ سچ ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کر لیا ہے؟ اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کئے بازار میں سے گزر جاتا ہے۔ مرید پور میں پوجا جاتا ہے؟ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگرس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی برسبیل تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا۔ کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن بہر حال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہونچ چکا ہوں؟

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جابجا جلسے نکل آئے جس کسی کو ایک میز ایک کرسی اور ایک گلدان میسر آیا۔ اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نوجوانان ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہہ و مہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لیے بیتاب ہے۔ مانا ملک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی ازحد ضرورت ہے۔ لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے کیونکہ ع خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر...... اسی طرح کی تین چار براہین قاطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آ کر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔

خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا۔ تو رفتہ رفتہ باشندگان مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

میں ایک کمزور انسان ہوں اور پھر لیڈری کا نشہ لمحے ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہل وطن کی بے حسی پر بڑا ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا کہ ان بیچاروں کی بہبودی اور رہنمائی کا ذمہ دار تو ہی ہے تجھے خدا نے تدبر کی قوت بخشی ہے۔ ہزاروں انسان تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ اٹھ کے سینکڑوں لوگ تیرے لیے ماحضر لیے بیٹھے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی۔ اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں

ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا۔ اسٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے۔ ہر ایک شخص کو چاہیئے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام ہوتے رہے۔

"ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔

"ہندو و مسلم شیر و شکر ہیں"۔

"ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیئے۔ اے میرے دوستو! ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں"۔

جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا۔ وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنھوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ"۔

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں "سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے ایک جا" والا واقعہ پڑھا تھا۔ اسے نکال کر نئے سرے سے پھر پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو ذہن نشین کر لیا۔ پھر یاد آیا۔ کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی۔ جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑ دو۔ وہ توڑ نہیں سکتے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز سوچا تو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی کہ۔

"پیارے ہم وطنو!"

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندستان کے جس مایۂ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلم بند کیے تھے۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا۔ اس کے یہ المناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندستان کی یہ حالت ہے...... وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد سوچا۔ کہ ہندستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا۔ افلاس غربت۔ بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا۔ اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا۔ جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی حکومت آب و ہوا۔ مغربی تہذیب لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا۔ اور پھر اصلی وجہ بتاؤں گا کہ اصلی وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا۔ اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا۔ کہ

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنا لیا اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا۔

۱۔ تمہید۔ اشعار حالی (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو۔)

۲۔ ہندستان کی موجودہ حالت

الف۔ افلاس

ب۔ بغض

ج۔ قومی رہنماؤں کی خود غرضی

۳۔ اس کی وجہ

کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں۔

کیا آب و ہوا ہے؟ نہیں۔

کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں۔

تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ۔ جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو)۔

۴۔ پھر بتاؤ کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے (نعروں کے لیے وقفہ) اس کا نقشہ کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔ (اس کے بعد شاید پھر چند نعرے بلند ہوں۔ ان کے لیے ذرا ٹھہر جاؤ)۔

۵۔ خاتمہ۔ عام نصائح خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر)

(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو۔)

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا رہا۔ اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکہ آرا فقروں کی مشق کرتا رہا ۔۳ کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب طرف پہنچ سکے اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سُن لیں۔

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ راستے میں سانگا کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی انجمن نوجوانانِ ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہار پہنائے۔ اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیے۔ سانگا سے مرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مرید پور پہنچی تو اسٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے۔ انھوں نے کہا۔ "سر باہر نکالیے۔ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہار میرے گلے میں تھے۔ ایک سنگترہ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھا تو اور لوگ بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پر مجھے سوار کرایا اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا۔ دائیں بائیں سُرخ سُرخ جھنڈوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔ مثلاً "ہندوستان کی نجات تمھیں سے ہے۔" "مرید پور کے فرزند خوش آمدید۔" "ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔"

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ صدرِ جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی۔

حضرات! ہندستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے ...."

تقریر کا لفظ سُن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یک لخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو ابھی اور کئی جیبیں ہیں گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن وہ کاغذ کہیں نہ ملا تمام حال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔ دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔

"مرید پور کا شہر ان پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات نوعِ انسان کے لیے........"

خدایا اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے نہیں اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہوگا جاہل کہنا چاہیے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ غیر مہذب۔

"........ ان کی اعلیٰ سیاست دانی۔ ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے"

ہاں وہ تقریر کاہے سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں لیکن وہ تو آخر میں ہیں۔ وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رُلائیں گے........"

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا۔ مجھے الفاظ بالکل نہ سنائی دیے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیرِ اثر اٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا۔ لیکن پھر سنبھل گیا میرا ہاتھ

کانپ رہا تھا۔ ہال میں ایک شور تھا۔ میں بیہوشی سے ذرا ہی درے تھا۔ اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خود غرضی بھی ضرور بیان کرنی ہے اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی۔" بگلے اور لومڑی کی کہانی...... نہیں ٹھیک ہے دو بیل......"

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سہارے کے لیے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا۔ بصد مشکل میں نے یہ کہا کہ:-

"پیارے ہم وطنو!

آواز خلاف توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیے میں نے گلے کو صاف کیا تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ پھیپھڑوں پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی۔ اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا:-

"پیارے ہم وطنو!"

اس کے بعد ذرا دم لیا۔ اور پھر کہا کہ:-

"پیارے ہم وطنو!"

کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

"پیارے۔ ہم وطنو!"

اب کے لوگوں کی ہنسی کا سے میں بھنا گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا۔ ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندستان کی آب و ہوا خراب یعنی

مرید پور کا پیر

ایسی ہے۔ کہ ہندستان میں بہت سے نقص ہیں..... سمجھے آپ؟ (وقفہ.....) نقص ہیں۔ لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ گویا چنداں صحیح نہیں۔" (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔ یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

"ہاں تو بات در اصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے۔

جو باہ جود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے۔" (زور کا قہقہہ)۔

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے میں نے کہا چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

"مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجئے۔ لکڑیاں اکثر مہنگی ملتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ گویا چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں۔ اس لیے گویا لکڑیوں کا گٹھا یعنی آپ دیکھئے نا۔ کہ اگر۔"

(بلند اور طویل قہقہہ)۔

"حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا۔ تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی نحوست منڈلا رہی ہے (قہقہے اور شور و غوغا..... "اسے باہر نکالو۔ ہم نہیں سنتے")۔

"شیخ سعدی نے کہا ہے کہ۔

چو از قومے یکے بے دانشی کرد

(آواز آئی "کیا بکتا ہے") خیر اس بات کو جانے دیجئے۔ بہر حال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ:۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس شعر نے دوران خون کو تیز کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا۔

"جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں ان کی زندگیاں لوگوں کے لیے شاہراہ ہیں۔ اور ان کی حکومتیں چار دانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی

بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے......"

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سُن سکتا تھا اکثر لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور گلا پھاڑ کر کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کر کے سگرٹ کی ایک خالی ڈبیہ مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے اردگرد اسٹیج پر آ گریں۔ لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

" حضرات! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے!"

" تم دو بیل ہو......"

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی۔ تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا۔ اور زقند بھر کے دروازے میں سے باہر کا رُخ کیا ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ بلکہ سیدھا بھاگتا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہونچ رہے تھے۔ اُن کو سُن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور سیدھا اسٹیشن کا رُخ کیا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں بے تحاشا اس میں گھس گیا۔ ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اس دن کے بعد آج تک نہ مرید پور نے مجھے مدعو کیا ہے۔ نہ مجھے خود وہاں جانے کی کبھی خواہش پیدا ہوئی۔

○

انجام بخیر

منظر :۔ ایک تنگ وتاریک کمرہ جس میں بجز ایک پُرانی سی میز اور ایک لرزہ براندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔

زمین پر ایک طرف چٹائی بچھی ہے جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے اس انبار میں سے جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شکسپیئر، ٹالسٹائی، ورڈز ورتھ وغیرہ مشاہیر ادب کے نام دکھائی دے جاتے ہیں۔

باہر کہیں پاس ہی کتے بھونک رہے ہیں۔ قریب ہی ایک برات اتری ہوئی ہے۔ اس کے بینڈ کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے۔ جس کے بجانے والے دق، دمہ، کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔

پطرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ نوجوان ہے لیکن چہرے پر گزشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار صرف کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے۔

سامنے لٹکی ہوئی جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔

باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پطرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔

تین طالب علم نہایت اعلیٰ لباس زیب تن کئے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پطرس۔ حضرات اندر تشریف لے آئیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس، صرف ایک کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے میرے فرزند اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو۔ اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم

لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کمرے میں ایک پُر اسرار نور سا چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)۔

طالب علم۔ (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے۔ اے ہمارے محترم استاد! ہم تمہارا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہئے

(کتابوں کو جوڑ کر ان پر بیٹھ جاتے ہیں)۔

پطرس کھولے ہندستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے دروازہ تک کشاں کشاں لے آئی؟

پہلا طالب علم اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ اتارنے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم۔ اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم۔ اے ہمارے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس۔ یہ نہ کہو، یہ نہ کہو! خود میری محنت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا۔ اس کا معاوضہ مجھے اس وقت وصول ہو گیا۔ جب میں نے تمہاری آنکھوں میں ذکاوت چمکتی دیکھی۔ آہ! تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے؟ تاہم تمہارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو اور بالکل مت گھبراؤ۔ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم (سر قد اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم اُستاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی پولیس اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش کڑی ہے۔ تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اُجالا ہو گیا۔ مقدس معلّم! تو جانتا ہے۔ آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم تیری خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے عالمانہ تبحر اور تیری بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ تاہم اظہار تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں اُسے قبول کر کہ ہماری احسانمندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس۔ تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بے قراری میرے جسم پر طاری ہو گئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پاکر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باہر بینڈ کی لذت ... دور سے بجنے لگتا ہے)۔

پہلا طالب علم۔ (آگے بڑھ کر) اے ہمارے مہربان مجھ حقیر کی نذر قبول کر (بڑے ادب و احترام کے ساتھ اٹھنی پیش کرتا ہے)۔

دوسرا طالب علم۔ (آگے بڑھ کر) اے فرشتے میرے ہدیے کو شرف قبولیت بخش۔ (اٹھنی پیش کرتا ہے)۔

تیسرا طالب علم۔ (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان مجھ ناچیز انسان کو مفتخر فرما (اٹھنی پیش کرتا ہے)۔

پطرس۔ (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو خداوند کی رحمت تم پر نازل ہو۔ تمہاری سعادت مندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمہیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو۔ اور خدا تمہارے سینوں کو علم نور سے منور کرے۔ (تینوں اٹھنیاں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)۔

طالب علم۔ (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے ہم فرض سے سبکدوش ہو گئے اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لیے بیتاب ہوں گے

پطرس۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ اور تمہاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں)۔

(انتہائی میں سربسجود ہو کر) باری تعالیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے ثمر کے لیے بہت دنوں انتظار میں رکھا۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں لیکن ہماری کم مائیگی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو میرے وسیلے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔ اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا بھی کفیل تو نے مجھ ہی کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

(کمرے میں پھر ایک پراسرار سی روشنی چھا جاتی۔ اور فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے سر اٹھاتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے)۔

نام نجیر

پطرس اے خدا کے دیانت دار اور محنتی بندے! ذرا یہاں تو آئیو۔

ملازم (باہر سے) اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا۔ کہ تعجیل شیطان کا کام ہے۔

(ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے دگنے لمبے ہو گئے ہیں)

پطرس آہ انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے بینڈ کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔

(سربسجود گر پڑتا ہے)

پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اٹھنیوں پر نظر پڑتی ہے۔ ان کو فوراً کتاب کے نیچے چھپا دیتا ہے۔

پطرس آہ! مجھے زر و دولت سے نفرت ہے۔ خدایا میرے دل کو دنیا کے لالچ سے پاک رکھیو!

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس۔ اے مزدور پیشہ انسان! مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ ضیاء علم کی ایک کرن بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ تاہم خداوند تعالےٰ کے دربار میں ہم سب برابر ہیں۔ تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے تیری تنخواہ کی ادائگی کا وقت سر پر آگیا۔ خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اٹھنیاں قبول کر اور باقی کے ساڑھے اٹھارہ روپے کے لیے کسی لطیفۂ غیبی کا انتظار کر۔ دنیا امید پر قائم ہے اور مایوسی کفر ہے۔

(ملازم اٹھنیاں زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے بینڈ زور سے بجنے لگتا ہے)۔

پطرس خدایا تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ۔ اور ادنےٰ طبقے کے لوگوں کا سایۂ درہم سے دور رکھ!

(پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

باورچی خانے میں کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بو آ رہی ہے ...... ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے چوگنے لمبے ہو گئے ہیں۔ بینڈ مستور بج رہا ہے

انجام بخیر

یکا یک باہر سڑک پر موٹروں کے آکر رک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے (تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے)۔

پطرس (کام پر سے سر اُٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز (باہر سے) حضور میں غلاموں کا غلام ہوں اور باہر دست بستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں۔ اور عرض حال کروں۔

پطرس (دل میں) میں اس آواز سے نا آشنا ہوں۔ لیکن لہجے سے پایا جاتا ہے کہ بولنے والا کوئی شائستہ شخص ہے۔ خدایا یہ کون ہے۔ (بلند آواز سے) اندر آجائیے۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ اور ایک شخص لباس فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔ گو چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے۔ لیکن نظریں زمین دوز ہیں اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے)۔

پطرس۔ آپ دیکھتے ہیں۔ کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہذا اے محترم اجنبی! اس انبار میں سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو۔ اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔

اجنبی۔ اے برگزیدہ شخص! میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

پطرس۔ تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

اجنبی۔ اے ذی علم محترم! گو کہ تم میری صورت سے واقف نہیں لیکن میں شعبۂ تعلیم کا افسر اعلیٰ ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کبھی نیازحاصل کرنے کے لیے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کر دو۔

(آبدیدہ ہو جاتا ہے)۔

پطرس۔ اے خدا! کیا یہ سب وہم ہے۔ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں۔

اجنبی۔ مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے یک اندر برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچنبھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر یقین کرو میں فی الحقیقت یہاں تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں اور تمہاری آنکھیں

تمھیں ہرگز دھوکا نہیں دے رہی ہیں۔ اے شریف غم زدہ انسان یقین نہ ہو تو میرے چٹکی لے کر میرا امتحان کر لو۔

(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔ اجنبی بہت زور سے چیختا ہے)۔

پطرس۔ ہاں! اب مجھے کچھ کچھ یقین آ گیا لیکن حضور والا آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانا میرے لیے اس قدر باعثِ فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی۔ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گذشتہ خطاؤں پر بہت نادم ہوں۔

پطرس۔ (مبہوت ہو کر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی۔ میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں۔ البتہ ایک عرض ہے اگر آپ منظور کر لیں تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھوں۔

پطرس۔ آپ فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔ گو مجھے یقین نہیں کہ یہ عالم بیداری ہے۔

(اجنبی تالی بجاتا ہے۔ چھ خدام چھ بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ اور زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجا لا کر چلے جاتے ہیں)۔

اجنبی۔ (صندوق کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہ معظم، شاہزادہ ویلز، وائسرائے ہند اور کمانڈر انچیف ان چاروں کے ایما پر یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدردانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں (بھرائی ہوئی آواز سے) ان کو قبول کیجیے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجیے۔ ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

پطرس۔ (صندوق کو دیکھ کر) سونا! اشرفیاں! جواہرات! مجھے یقین نہیں آتا (آیۃ الکرسی پڑھنے لگتا ہے)۔

ان کو قبول کیجیے۔ اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجیے۔ (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)

گانا۔ آج موری انکھیاں پل نہ لاگیں۔

اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں۔ اور تو گا کیوں رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت اور ہمت دے۔ میں خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے

انجام بخیر

ہیں۔ بس اب جاکر ہمارے مطالعے کا وقت ہے۔ کل کالج میں اپنے لیکچروں سے ہمیں چار پانسو روحوں کو خواب جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں؟

پطرس خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوق کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے۔ اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پُر اسرار نور چھا جاتا ہے۔ اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے باہر بینڈ بدستور بج رہا ہے۔)

○

سینما کا عشق

"سینما کا عشق" عنوان تو عجب ہوس خیز ہے۔ لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی توقعات مجروح ہوں گی۔ کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ سمجھے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں یا سینما کی موسیقی اور تاریکی میں جو ہیجان انگیزی ہے میں اس کا قائل نہیں ہوں تو سینما کے معاملے میں اوائل عمر ہی سے بزرگوں کا مورد عتاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کی طفیل سینما گویا میری ایک دکھتی ہوئی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اس کا نام سُن پاتا ہوں بعض درد انگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی کچھ ہی بن گئی ہے۔

اوّل تو خدا کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہونچ سکے۔ اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں۔ یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارے دوست ہیں۔ لیکن خدا شاہد ہے۔ ان کی دوستی سے جو نقصان ہمیں پہونچے ہیں۔ کسی دشمن کے قبضۂ قدرت سے بھی باہر ہوں گے۔

جب سینما جانے کا ارادہ ہوا۔ ہفتہ بھر پہلے سے انھیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا جی اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟ میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں۔ اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں کوئی حرج واقع نہ ہو۔ لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے ہیں۔

"ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور پھر کبھی ہم نے تم سے آج تک ایسی بے مروتی بھی برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو"؟

سینما کا عشق

ان کی تقریر سُن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر چپ رہتا ہوں اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں۔

"بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صرف ان کو بات جھانے کے لیے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

"کیوں بھئی سینما آج کل چھ بجے شروع ہوتا ہے نا؟"

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں۔ "بھئی یہ ہمیں معلوم نہیں۔"

"میرا خیال ہے چھ ہی بجے شروع ہوتا ہے۔"

"اب تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں۔"

"نہیں مجھے یقین ہے۔ چھ بجے شروع ہوتا ہے۔"

"تمھیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟" اس کے بعد آپ ہی کہیے میں کیا بولوں؟

خیر جناب جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہو جاتا ہوں اس خیال سے کہ جلدی جلدی انھیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں۔ تو آدم نہ آدم زاد۔ مردانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں۔ ہر کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں۔ ہر شگاف میں سے آوازیں دیتا ہوں لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تھک آکر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ پھر سگرٹ سلگا لیتا ہوں اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آجاتا ہوں اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں ہر کالم کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں؟ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں؟ یا نہا رہے تھے تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں؟ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج کر واپس آجاتی ہے۔ آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو

بڑی مشکل سے تر نظر رکھ کر پوچھتا ہوں۔

"کیوں حضرت! آپ اندر ہی تھے؟"

"ہاں اندر ہی تھا۔"

"میری آواز آپ نے نہیں سُنی؟"

"اچھا، تم تھے؟ میں سمجھا کوئی اور ہے۔"

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں۔ اور دانت پیس کر غصّے کو پی جاتا ہوں اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں۔

"تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟"

"وہ کہاں؟"

"ارے بندۂ خدا آج سینما نہیں جانا؟"

"ہاں سینما، سینما (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے سینما میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آتی۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ ورنہ مجھے رات بھر اُلجھن رہتی۔"

"تو چلو پھر اب چلیں۔"

"ہاں وہ تو چلیں ہی گے میں سوچ رہا تھا آج ذرا کپڑے بدل لیتے خدا جانے دھوبی کم بخت کپڑے بھی لایا ہے یا نہیں۔ یاران دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔"

اگر قتلِ انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا۔ تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا۔ لیکن کیا کروں۔ اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں۔ بے بس ہوتا ہوں۔ صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ

"مرزا بھئی للّٰہ مجھ پر رحم کرو میں سینما چلنے کو آیا ہوں۔ دھوبیوں کا انتظام کرنے نہیں آیا۔ یار بڑے بدتمیز ہو۔ پونے چھ بج چکے ہیں۔ اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔"

مرزا صاحب عجیب مربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی پر سے اُٹھتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اچھا بھئی تمھاری طفلانہ خواہشات آخر ہم پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ پھر یہ کہہ کر اندر تشریف لے جاتے ہیں۔ کہ اچھا، کپڑا پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا

تو قانون کی رو سے انھیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے تک پہنچ کر مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب پھر اندر جاتا ہوں۔ مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کر یدکر رہے ہوتے ہیں۔

"ارے بھئی چلو۔"

"چل تو رہا ہوں یار۔ آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟"

"اور یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"پان کے لیے ذرا تمبا کو لے رہا تھا۔"

تمام رستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں وہ ساتھ آ ملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں پھر آگے نکل جاتا ہوں پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرضیکہ گو چلتا دگنی رفتار سے ہوں لیکن پہونچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز دیتا ہے۔ "یہ دروازہ بند کر دو!" یا اللہ اب جاؤں کہاں۔ رستہ۔ کرسی۔ دیوار۔ آدمی کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں تو سر ان بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لیے دیوار پر لٹکی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر سا دھبہ دکھائی دے جائے وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں۔ اس کے پاؤں کو پھاند۔ اس کے ٹخنوں کو ٹھکرا۔ خواتین کے گھٹنوں سے دامن بچا، آخر کار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں۔ وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں۔ اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہونچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں "میں نہ کہتا تھا کہ جلدی چلو۔ خواہ مخواہ میں ہم کو رسوا کرا دیا نا! گدھا کہیں کا!" اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم

کون سا ہے۔ اس کی کہانی کیا ہے۔ اور کہاں تک پہونچ چکی ہے؟ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے۔ تو معاملہ کھلے کہ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع و فراخ انگڑائی لیتے ہیں جس کے دوران میں کم از کم دو تین سو فٹ فلم گزر جاتا ہے۔ جب انگڑائی کو لپیٹ لیتے ہیں تو پھر سر کھجانا شروع کرتے ہیں اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے بلکہ بازو کو ویسے ہی خمیدہ رکھتے رہتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے جائے دانی کے اس دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لیے راستہ نکال لیتا ہوں اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں کرسی کی نشست پر کوئی مچھّر یا پسّو محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دائیں طرف سے ذرا اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں۔ ایک دو لمحے کے بعد وہی مچھّر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں غرضیکہ یہ دل لگی یونہی جاری رہتی ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں۔ وہ بائیں تو میں دائیں ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں کہ لے بیٹا دیکھوں تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے "یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم تو دیکھنے دو۔"

اس کے بعد غصّے میں آ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اور قتل عمد۔ خود کشی۔ زہر خورانی وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں۔ دل میں کہتا ہوں۔ ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا۔ اور اگر آیا بھی تو اس کمبخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے سے آ جاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اچھلتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرے والی پگڑی پہن کر آؤں گا۔ اپنے

اوور کوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا۔ بہر حال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا!۔

لیکن اس کم بخت دل کو کیا کروں۔ اگلے ہفتے پھر کسی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سنیما چلو گے نا؟

○

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی۔ لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے۔ اس لیے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے۔ کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ تصویروں اور موسیقی کا شوق اسے بھی تھا۔ میں بھی ہمہ دانی کا دعویدار۔ اکثر گیلریوں، کانسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔ کتابوں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر ایک کوئی نئی کتاب یا نیا مصنف "دریافت" کرتا تو دوسرے کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے بُرے کا حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی۔ عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے۔ تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویے میں ہم کبھی نہ کبھی اس کی تکذیب ضرور کر دیتے تھے۔ بعض حالات کے ماتحت میبل ایسی رعایت کو اپنا حق سمجھتی۔ جو صرف ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہئیں اور بعض اوقات میں تحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا یہی فرض ہے۔ خصوصاً مجھے یہ احساس بہت زیادہ تکلیف دہ تھا۔ کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔ اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہونچتا تھا۔ کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشائی آباد اجداد کا خون جوش مارتا۔ اور میرا دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔ اس طرف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی۔

یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کو کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیوں کر نظر انداز کرتا۔ کہ بیبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی۔ اور ہفتہ بھر کے بعد انھیں میرے کمرے میں پھینک کر چلی جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی کہ میں انھیں پڑھ چکی ہوں۔ تم بھی پڑھ چکو گے۔ تو ان کے متعلق باتیں کریں گے

اوّل تو میرے لیے ایک ہفتہ میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا۔ لیکن فرض کیجیے مردوں کی لاج رکھنے کے لیے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو کبھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں۔ کہ ان کے سمجھنے کے لیے مجھے کافی عرصہ درکار ہوتا چنانچہ ہفتہ بھر کی جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا اور وہ نہایت عالمانہ انداز میں بھویں اوپر کو چڑھا چڑھا کر باتیں کرتی۔ جب میں اس کے لیے دروازہ کھولتا۔ یا اس کے سگرٹ کے لیے دیا سلائی جلاتا۔ یا اپنی سب سے زیادہ آرام دہ کرسی اس کے لیے خالی کر دیتا۔ تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں۔ بلکہ حق اُستادی سمجھ کر قبول کرتی۔

بیبل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصّے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جان یا مال کا ایثار سہل ہے لیکن آن کی خاطر نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اُتر آتا ہے۔ اُسے میری اخلاقی پستی سمجھیے۔ لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی۔ اگلی دفعہ جب بیبل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہیں پڑھی تھیں۔ ان پر بھی میں نے رائے زنی شروع کر دی لیکن جو کچھ کہتا تھا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا۔ تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا تھا سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق بیبل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لاابالیانہ کہا۔

"ہاں اچھی ہے۔ لیکن کچھ ایسی اچھی بھی نہیں۔ مصنف سے دورِ جدید کا نقطۂ نظر کچھ نبھ نہ سکا۔ لیکن پھر بھی بعض نکتے نرالے ہیں۔ بُری نہیں۔ بُری نہیں؟"
کنکھیوں سے میبل کی طرف دیکھا گیا۔ لیکن اسے میری ریاکاری بالکل معلوم نہ ہونے پائی۔ ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا۔
"ہاں پڑھا تو ہے۔ لیکن ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"
اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی۔ اور گفتگو کا بار بھی میبل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔
تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا۔
"اس نقاد پر اٹھارویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یونہی نامعلوم سا کہیں کہیں۔ بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے۔ بہت دلچسپ۔ بہت دلچسپ۔"
رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال ہو گیا۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا۔ اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔
اب میں میبل سے نہ دبتا تھا۔ اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔ وہ اگر ہفتہ میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں احساسِ فتحمندی سے بالیدگی سی آ گئی تھی اب میں اس کے لیے کرسی خالی کرتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔
صراطِ مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں تو نہ سراہیں۔ لیکن میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لیے مجھ پر دُہری دُہری لعنتیں بھیجیں گی کہ ایک تو میں نے مکاری اور جھوٹ

سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکا دیا۔ ان کی تسلّی کے لیے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانیے کئی دفعہ تنہائی میں میں نے اپنے آپ کو بُرا بھلا کہا۔ بعض اوقات آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھلانا بھی مشکل ہو گیا کہ میں بغیر پڑھے ہی کے علمیت جتاتا رہتا ہوں ہیبل تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے تو بہرحال اس کو مجھ پر تفوق تو ضرور حاصل ہے۔ میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ وہ کتابیں نہیں پڑھا میری جہالت اس کے نزدیک نہیں میرے اپنے نزدیک تو مسلّم ہے۔ اس خیال سے اطمینان قلب پھر مفقود ہو جاتا۔ اور اپنے آپ ایک عورت کے مقابلے میں پھر حقیر نظر آنے لگتا ہے پہلے تو ہیبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا۔ اب وہ اپنے مقابلے میں پاکیزگی اور راستبازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میں میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں صحتیاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ انہی دنوں مجھے خفیف سا انفلوائنزہ ہوا۔ مہلک نہ تھا۔ بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا۔ تاہم گذشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ، گناہ بن کر نظر آنے لگے۔ ہیبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت ہیبل کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی۔ دوا پلائی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا۔ (میری آواز بھرائی ہوئی تھی) "ہیبل مجھے خدا کے لیے معاف کر دو" اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک تفصیل بیان کر دی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا۔ "ہیبل پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں۔ ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں۔ لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہوگی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہوگا۔

کہنے لگی: "نہیں تو۔"

میں نے کہا "مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیرکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بک رہا تھا۔ وہ سب من گھڑت تھا۔"

کہنے لگی "کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔"

میں نے کہا۔ "پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے یہ بھی ٹھیک تھا؟"

کہنے لگی: "ہاں! پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔"

اس کے بعد میری گذشتہ فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے میبل رخصت ہونے لگی تو بولی۔ "تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟"

میں نے کہا۔ "ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا۔ لیکن اب میں انھیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں انھیں یہیں رہنے دو۔ تم تو انھیں پڑھ چکی ہو؟"

کہنے لگی "ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا میں یہیں چھوڑے جاتی ہوں۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا تینوں میں سے کسی ایک کے ورق تک نہ کٹے تھے۔ میبل نے بھی انھیں ابھی تک نہ پڑھا تھا۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

○

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پُرانی ہو جائے۔ تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب بھی کسی کی موٹر کار کو دیکھوں۔ مجھے زمانے کی ناز سازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے۔ اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں۔ اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے۔ کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں۔ میرے دماغ۔ میرے معدے اور میری تلی تک پہونچ جائے۔ تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں۔ جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی۔ اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں۔ کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا۔ اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مرزا ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے "بھئی کچھ ہو گا ہی نا آخر۔"

میں نے کہا۔ "میں بتاؤں تمھیں؟"

کہنے لگے: "بولو۔"

میں نے کہا "کوئی فرق نہیں سنتے ہو مرزا؟ کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں....... کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں۔ تم جگالی نہیں کرتے ان کے دُم ہوتی ہے۔ تمہارے دُم نہیں لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں لیکن ایک بات میں میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں۔ میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمھارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں۔ اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں۔ سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔ یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں دوسرا اُٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں۔ پہلا اُٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابلِ توجہ نہیں یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا "اچھا مرزا یونہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت بھینچ کر لیے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا جب مرزا سننے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا "سُنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لیے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے۔ تاکہ تمھیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے "ہوں۔"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ سگرٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا۔ کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے "ہوں۔"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولے۔ تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔ لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں"

میں نے کہا "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمھیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول اور کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے پھر بھی اس وقت تمھارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو۔ مرزا اس وقت تمھاری جو ذہنی کیفیت ہے۔ اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مرزا صاحب کہنے لگے: "نہیں یہ بات تو نہیں میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری میں نے کہا۔ "میں اپنی کئی قیمتی اشیا بیچ سکتا ہوں۔"

مرزا بولے "کون کون سی مثلاً؟"

میں نے کہا: "ایک تو میں اپنا سگرٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔"

مرزا کہنے لگے: "چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے روک دیا جائے چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی۔ کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں؟ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے "میں تمھیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو۔"

میں نے کہا: "وہ روپیہ کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا۔"

کہنے لگے "مفت۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا: "مفت؟ وہ کیسے؟"

کہنے لگے "مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے؟"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت جوانی کی خوش دلی۔ اُبلتے ہوئے فوّاروں کی موسیقی۔ اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہی ہنسی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا "یہ کس کی؟"

مرزا بولے "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ تم لے لو۔"

"میں نے کہا "پھر کہنا پھر کہنا!"

کہنے لگے "بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے جب میری ہے تو تمھاری ہے۔ تم لے لو۔"

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں

صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کرلی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا۔ "مرزا سب سے پہلے تو میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لیے معافی مانگتا ہوں۔ جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کردو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، ممسک، خودغرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کردیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں مجھے معاف کردو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ لیکن مرزا صاحب کہنے لگے "واہ! اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے جیسے میں سوار ہوا ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا، "مرزا مفت میں نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے: "بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا۔ تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے۔ احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "خیر کچھ بھی سہی تم سچ مچ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے، قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لیے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے "نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوتی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا۔ اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنھیں کالج کے سر پھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے"۔

"مگر مرزا یونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا" اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے میں تو اس کی آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا"۔

مرزا کہنے لگے "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔ اوّل تو قیمت لینا نہیں چاہتا لیکن.........؟"

میں نے کہا "مرزا قیمت تو تمھیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو..... میں تمھاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں۔ تم گھر جا کے گن لینا۔ اگر تمھیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں، یہ تو کچھ دوکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے"۔

مرزا بولے "بھئی جیسے تمھاری مرضی میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو، لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے"۔

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا۔ استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں۔ لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ بیچارہ تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو لیکن مفت میں کیسے لے لوں۔ آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور ٹانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ سب دبود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں بیتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے پچاس تو ہو نہیں سکتے۔ اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس کیوں نہ دیے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں بس ٹھیک ہے۔ چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کرلے۔

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیے

اور کہا "مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیری رقم منظور کرنا تمھیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔"

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ مرزا کل ضرور صبح بھجوا دینا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا "کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے۔ دیر نہ کرنا...... خدا حافظ........ اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپیوں کو بھی زیادہ سمجھنا...... خدا حافظ...... اور تمھارا بہت بہت شکریہ۔ میں تمھارا بہت ممنون ہوں اور میری گستاخی کو معاف کر دینا۔ دیکھو نا کبھی کبھی یونہی بے تکلفی میں...... کل صبح آٹھ نو بجے...... ضرور...... خدا حافظ۔"

مرزا کہنے لگے "ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا اور تیل وغیرہ ڈلوا دینا میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا ورنہ تم خود ڈلوا دینا۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں! وہ سب کچھ ہو جائے گا۔ تم کل صبح ضرور دینا اور دیکھنا آٹھ بجے تک یا ساڑھے سات تک پہنچ جائے۔ اچھا..... خدا حافظ!"

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر اردگرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈرات کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح ہواخوری کے لیے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے، میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ، ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہو گا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ، جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ بار بار دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگا لوں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔ صبح اٹھا تو اٹھتے ہی نوکر نے یہ خوش خبری سنائی کہ حضور وہ بائیسکل آگئی ہے۔ میں نے کہا "اتنے سویرے؟"

نوکر نے کہا "وہ تو رات ہی کو آگئی تھی۔ آپ سو گئے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہ

سمجھا۔ اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا۔ لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپے لے لیے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا "دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو۔ بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے۔ اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ اور دیکھو! ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے، ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا اور بائیسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے۔ جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اور بائیسکل باہر نکال رکھو۔ ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ذرا سیر کو جا رہے ہیں اور دیکھو صاف کر دینا اور بہت زور زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا، بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔"

جلدی جلدی چائے پی۔ غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ "چل چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے، اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا "کیوں بے، یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے؟"

میں نے کہا "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"

کہنے لگا "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے۔ آپ کے لیے۔"

میں نے کہا۔ "اور جو بائیسکل رات کو انھوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا "کیا بکتا ہے جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی۔ وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا۔ "جی ہاں۔"

میں نے کہا "اچھا" اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور، دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب خیال نہ کیا۔

"اور تیل لایا؟"

"ہاں حضور لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور دھروں پہ میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا۔ جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا تو ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی ادھ جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیئے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا چنانچہ نوکر بولا "حضور وہ تیل تو سب ادھر ادھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چاں چوں کی قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیئے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھڑ کھڑ کھڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر چرخ۔ چر چرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔

زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا۔ زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑچڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ..... کی صدا نکل رہی تھی جب اتار پر بائیسکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے۔ بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لیے چوں چوں پھٹ۔ چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ چچوں پھٹ چچوپھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لیے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا۔ تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیوں کی اٹھکیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہو جانا ازحد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کر لوں چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے

اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں جیب سے میں نے اوزار نکالا۔ گدّی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہوا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدّی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا۔ کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا۔ جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لیے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدّی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا "دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے"۔ گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدّی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم دونوں برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا۔ کہ اب کے گدّی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا۔ بلکہ جسم کو گدّی سے قدرے اوپر ہی رکھتا۔ لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقررہ باقاعدگی اختیار کر لی۔ تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑکھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا "ذرا اس کی مرمت کر دیجیے"۔

ایک مستری آگے بڑھا۔ لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوا تھا اس نے

بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا " کس کس پرزے کی مرمت کرائے گا؟"

میں نے کہا " بڑے گستاخ ہو تم۔ دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے۔ بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا " مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟"

میں نے کہا " ہاں، وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا " اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرا لیں تو اچھا ہو۔"

میں نے کہا " اچھا کر دو۔"

بولا " یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جایئے۔"

" اور پیسے کتنے لو گے؟"

کہنے لگا " بس تیس چالیس روپے لگیں گے۔"

ہم نے کہا " بس جی۔ جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

" تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا " میں نے کس تو دیا ہے، لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا " ہیں، بدتمیز کہیں کا تو دو آنے پیسے مفت میں لے لیے؟"

بولا " جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت ملی ہو گی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ للو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں۔ لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا " واہ، مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔"

مستری نے کہا " ہاں تو وہ ٹھیک ہے۔ لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے

تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی۔"

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہوگئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے اس لیے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جابجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا ورنہ میں پاگل ہو جاتا۔ اور جنوں کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے"

دکاندار کہنے لگا "پھر"

میں نے کہا "لوگے؟"

کہنے لگا "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "بیچتے ہیں ہم۔"

دوکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخر کار بولا "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر"؟

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ

جو روپے مجھے وصول ہوں گے۔ ان کا مصرف کیا ہوگا؟"

کہنے لگا "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟"

کہنے لگا "اچھا! چڑھ گیا۔ پھر؟"

میں نے کہا "پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا؟"

دوکاندار بولا "اچھا؟ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا انھوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بُو سونگھ رہے ہوں۔

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تو آپ یہ سچ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لیے میں گھر سے یہ بہانہ گڑھ کر لایا تھا۔"

کہنے لگا "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا "تمھیں بتاؤ۔"

کہنے لگا "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

پھر کہنے لگا "سچ سچ بتادوں؟"

میں نے کہا "اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا "تین روپے دوں گا اس کے۔"

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا "او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان مجھے اپنی توہین کی روا نہیں لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین تک لحت

اُچھل کر مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا۔ ادھر اُدھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ جو اس بجا ہوئے تو معلوم ہوا میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں۔ گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا! ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے۔ جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دوکان تھی۔ جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہو گیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما۔ اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی۔ ورنہ حاشا وکلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اُٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیے کاہے کو لے جا رہے ہو؟

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمھیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں انھیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قسم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں آخر ہوا کیا؟ محض ایک حادثہ! بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی، "بس حضرت غصہ تھوک ڈالیے"۔ ایک دوسرے صاحب بولے "بے حیا بائیسکل گھر پہنچ کر تجھے مزہ چکھادوں گا"۔ ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے۔ میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے، "دیکھا بیٹا یہ سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ ہوتے ہیں"۔

لیکن میں چلتا گیا تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں چلتا گیا حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا پُل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک

دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہوگیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے "اندر آجاؤ۔"

میں نے کہا "آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کیے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں؟"

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا۔ جو انھوں نے بائیسکل کے ساتھ ہی مفت مجھ کو عنایت فرمایا تھا۔ اور یہ کہا:

"مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے، میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی۔

○

لاہور کا جغرافیہ

تمہید۔ تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کرّے کو دائیں سے بائیں گھمائیے حتیٰ کہ ہندستان کا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے۔ پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے۔ جہاں یہ نام کرّے پر مرقوم ہو وہی لاہور کا محلِ وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور، لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محلِ وقوع۔ ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے، وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہوئے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے دوسرا یو۔پی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یو۔پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولیٰ

دیکھتے ہیں۔

حدودِ اربعہ ۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدودِ اربعہ بھی ہوا کرتا تھا۔ لیکن طلبا کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے۔ لیکن ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع عارضہ ہے جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا ۔ لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں، جب کہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، اہلِ لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں۔ بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامّہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں۔ جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب کے لیے ایک اسکیم عرصے سے کمیٹی کے زیرِ غور ہے۔ یہ اسکیم نظام سقّے کے وقت سے چلی آتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقّے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آرہی ہے۔ اس لیے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی

عرصے میں ہر محلّے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو رائے دہندگی کے موقع پر بر رائے دہندہ بہت کام آئے گا۔

نظام سقّے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا نل لگوا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہلِ شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت۔ جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے آمد و رفت کے ذرائع کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کماحقہٗ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے۔ بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں اُلٹتے ہیں اور عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو ہک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانگ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دُم دار ستارے

سے ملتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے اور اس ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے۔ تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنے نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک تمام لطف اندوز ہو سکے۔

قابل دید مقامات۔ لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کو پلستر کر دیا جاتا ہے۔ جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً "اہل لاہور کو مژدہ" یا اچھا اور سستا مال" اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً "گریجوایٹ درزی ہوس" یا "سٹوڈنٹوں کے لیے نادر موقع" یا "کبھی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا" رفتہ رفتہ گھر کی چاردیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظہ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سُرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لحہ بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیے جاتے ہیں، یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے

تک وہاں اہالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بحروف جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں "بجلی پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "خاص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے۔ "کرشنا بیوٹی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت۔ اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے۔ اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی کانفرنس مذہبی کا افتتاح کرتا ہے، سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار۔ لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلباء ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلباء کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلباء عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد کسی رستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔

غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گرد و نواح میں ۔۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں، لیکن سب کی تصویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں، اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔ اس لیے ہندستان کا تخت وتاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لیے نکلتے ہیں اور جود وسخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انھیں راس نہیں آتی اس لیے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔

تیسری قسم خیالی طلبا کی ہے۔ یہ اکثر روپ اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باواز بلند تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں اور آفرینش اور نفسیاتِ جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے علی الصباح پانچ چھ ڈنٹر پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سُرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے۔ اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی اَنّا کے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

۱۔ لاہور تمھیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔

۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لیے سزا بھی تجویز کرو۔

۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

بچے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے، جن کی ظاہرا تو کئی قسمیں ہیں، کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے، کوئی پھول سا بچہ ہے اور کوئی چاند سا بچہ ہے لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں، جب تک برخوردار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے، بچے نے ان سب عطابات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔

جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں، یہ میں نے اور حکماء کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ حاشا وکلا میں اس بات کا قائل نہیں کہتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چپ کرانا، میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں، شعر پڑھے ہیں، ناچ ناچے ہیں، تالیاں بجائی ہیں، گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں، بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کئے ہیں کیا مجال جو اس بچے کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو یا جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو اور خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو کس وقت؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب اس کے لیے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجیے۔ ہنسانا ہو تو مہمل سے فقرے بے معنی سے بے معنی منہ بنا کر بلند سے بلند آوازیں ان کے سامنے دہرائیے اور کچھ نہ ہو تو شغل کے لیے

کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجھنا دے دیجیے۔ یہ جھنجھنا بھی کم بخت کسی بے کار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجیے لڑھکا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے سُری کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے "ماما یا بابا" کے جوش میں آکر برخوردار کو ایک عدد ربڑ کی گڑیا منگوا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لیے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں۔ سوائے شاید اس ربڑ کے تھیلے کے جس کے منہ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں بدقسمت تو وہ بے چارے ہیں جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بے چارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک جاتا ہے تو ان کا دوسرا برخوردار شروع ہو جاتا ہے۔ وہ ہار جاتا ہے تو تیسرے کی باری آتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی والے بچے الگ ہیں۔ ان کا سُر ذرا باریک ہے۔ آپ انگلیاں چٹخوا کر، سر کی کھال پہ تیل تھسوا کر، کانوں میں روئی دے کر لحاف میں سر لپیٹ کر سوئیے۔ ایک لمحے کے اندر آپ کو جگا کے اٹھا کے بٹھا نہ دیں تو میرا ذمہ۔

انہی مرزا صاحب کے گھر جب میں جاتا ہوں تو ایک ایک بچے کو بلا کر پیار کرتا ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ کئی دفعہ دل میں آیا مرزا صاحب سے کہوں حضرت آپ کی ان نغمہ سرائیوں نے میری زندگی حرام کر دی ہے۔ نہ دن کو کام کر سکتا ہوں نہ رات کو سو سکتا ہوں۔ لیکن یہ میں کہنے ہی کو ہوتا ہوں کہ ان کا ایک بچہ کمرے میں آ جاتا ہے، اور مرزا صاحب ایک والدانہ تبسم سے کہتے ہیں "اختر بیٹا! ان کو سلام کرو۔ سلام کرو بیٹا، اس کا نام اختر ہے۔ صاحب بڑا اچھا بیٹا ہے۔ کبھی ضد نہیں کرتا، کبھی نہیں روتا، کبھی ماں کو دق نہیں کرتا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ وہی

بچہ

نالائق ہے جو رات کے دو بجے گلا پھاڑ پھاڑ کے روتا ہے۔ مرزا صاحب قبلہ تو شاید اپنے خراٹوں کے زور شور میں کچھ نہیں سنتے، بدبختی ہماری ہوتی ہے لیکن کہتا یہی ہوں کہ "یہاں آؤ بیٹا" گھٹنے پر بٹھا کر اس کا منہ بھی چومتا ہوں۔

خدا جانے آج کل کے بچے کس قسم کے بچے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بقرعید کو تھوڑا سا رو لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی مہمان آ نکلا۔ تو نمونے کے طور پر تھوڑی سی ضد کر لی! کیونکہ ایسے موقع پر ضد کارآمد ہوا کرتی تھی لیکن یہ کہ چوبیس گھنٹے متواتر روتے رہیں۔ ایسی مشق ہم نے کبھی بہم نہ پہنچائی تھی۔

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہاربازوں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لیے شروع ہی میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ شاید آپ پہچاننے نہ پاتے۔

میں اشتہار دینے والا ایک روزنامہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گذرا ہوگا اس کے جواب میں کئی امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازمین رکھ لیا گیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتے دو ہفتے سے زیادہ ٹھہرنے نہ پایا۔ آتے کے ساتھ ہی یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھے تھے۔ ہمارا مطلب کچھ اور تھا، مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات ہم پر روشن ہوئیں تو تعلقات کشیدہ ہوئے۔ تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی اس کے بعد یا تو وہ خود ہی ناشائستہ باتیں ہمارے منھ پر کہہ کر جانے والے کا بل ادا کیے بغیر چل دیے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کیے۔ جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو احتیاطاً دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر لیڈر ہی کے شائع کرنا پڑا، چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل نہ چاہے وہ بے شک کوئی پریس الاٹ کرا کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

امیدوار کے لیے سب سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو، ایک نوجوان

کو ہم نے شروع میں ترجمے کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو پھر بولے کہ میں مترجم ہوں سب ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لیے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں، مترجم نہیں ہوں۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ ناتجربے کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں ہم سے بگڑنے لگے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے ایک تیسرے صاحب نے ہمارے ایمان اور ہمارے صرف و نحو دونوں پر فحش حملے کیے اس لیے ہم واضح کیے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور اس کے لیے صرف و نحو کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً ساتھ کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنے یہی ہیں ایڈیٹر کا ہم صنف اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا اخبار زنانہ اخبار نہیں لہٰذا کوئی خاتون ملازمت کی کوشش نہ فرمائیں۔ پہلے خیال تھا کہ اشتہار میں اس بات کو صاف کر دیا جائے اور لکھ دیا جائے کہ مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو مرد ہوں لیکن پھر خیال آیا کہ لوگ مرد کے معنے شاید جوانمرد سمجھیں اور اہل قلم کی بجائے طرح طرح کے پہلوان نیشنل گارڈ والے اور مجاہد پٹھان ہمارے دفتر کا رخ کریں۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ آخر عورتیں کیوں آئیں گی مردوں کی ابھی کیا قلت ہے۔ لیکن ایک دن ایک خاتون آ ہی گئیں۔ پرزے پر نام لکھ کر بھیجا۔ ہمیں معلوم ہوتا کہ عورت ہے تو بلاتے ہی کیوں؟ لیکن آج کل کم بخت نام سے تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ فاطمہ، زبیدہ، عائشہ کچھ ایسا نام ہوتا تو میں غسل خانے کے رستے باہر نکل جاتا لیکن وہاں تو ناز جھانجھروی، یا عندلیب گلستانی یا کچھ ایسا ہی فینسی نام تھا۔ آج کل لوگ نام بھی تو عجیب عجیب رکھ لیتے ہیں غلام رسول، احمد دین، مولا داد ایسے لوگ تو ناپید ہی ہو گئے ہیں جسے دیکھیے نظامی گنجوی اور سعدی شیرازی بنا پھرتا ہے۔ اب تو اس پر بھی شبہ ہونے لگا کہ حرارت عزیزی، نزلہ کھانسی، ثعلب مصری ادیبوں ہی کے نام نہ ہوں، عورت مرد کی تمیز تو کوئی کیا کرے گا۔ بہرحال ہم نے اندر بلایا تو دیکھا کہ عورت ہے۔ دیکھا کے یہ معنی ہیں کہ ان کا برقعہ دیکھا اور حسن ظن سے کام لے کر اندازہ لگایا کہ اس کے

اخبار میں ضرورت ہے

اندر عورت ہے۔ ہم نے بصد ادب و احترام کہا کہ ہم خواتین کو ملازم نہیں رکھتے۔ انھوں نے وجہ پوچھی۔ ہم نے کہا پیچیدگیاں، کہنے لگیں آگے بولیے ہم نے کہا پیدا ہوتی ہیں۔ بھڑک کر بولیں کہ آپ بھی تو عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے کیونکہ اس امر کا ہماری سوانح عمری میں کہیں ذکر نہیں اس لیے ہم تائید تردید کچھ نہ کر سکے۔ میری ولادت کو انھوں نے اپنا تکیہ کلام بنا لیا، بہتیرا سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور بہرحال میری ولادت کو آپ کی ملازمت سے کیا تعلق؟ اور یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں اگر ہمارے پروپرائٹر سے کہیں تو وہ آپ کی اور میری ہم دونوں کی ولادت کے متعلق وہ وہ نظریے بیان کریں کہ آپ ہکا بکا رہ جائیں۔ خدا خدا کر کے پیچھا چھوٹا۔

ہمارے اخبار میں پروپرائٹر کا احترام سب سے مقدم ہے۔ وہ شہر کے ایک معزز ڈپو ہولڈر ہیں۔ اخبار انھوں نے محض خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے لیے جاری کیا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ پبلک ان کی شخصیت اور مشاغل سے ہر وقت باخبر رہے۔ چنانچہ ان کے پوتے کا ختنہ ان کے ماموں کا انتقال، ان کے صاحبزادے کی میٹریکولیشن میں حیرت انگیز کامیابی (حیرت انگیز اس معنوں میں کہ پہلے ہی ریلے میں پاس ہو گئے)

ایسے واقعات سے پبلک کو مطلع کرنا ہر سب ایڈیٹر کا فرض ہو گا نیز ہر اس پریس کانفرنس میں، جہاں خورد و نوش کا انتظام بھی ہو، ہمارے پروپرائٹر مع اپنے دو چھوٹے بچوں کے، جن میں سے لڑکے کی عمر سات سال اور لڑکی پانچ سال ہے، شریک ہوں گے اور بچے فوٹو میں بھی شامل ہوں گے اور اس پر کبھی سب ایڈیٹر کو زیرِ لب فقرے کسنے کی اجازت نہ ہو گی۔ یہ بچے بہت ہی ہونہار ہیں اور حالاتِ حاضرہ میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں کشمیر کے متعلق پریس کانفرنس ہوئی، تو چھوٹی بچی ..... اتنے زور سے روئی کہ خود سردار ابراہیم اسے گود میں لیے لیے پھرے تو کہیں اس کی طبیعت سنبھلی۔

ہمارے اخبار کا نام آسمان ہے پیشانی پر یہ مصرعہ مندرج ہے کہ آسمان ہا دل کا پہلے خرقہ دیرینہ ہے، اس فقرے کو ہٹانے کی کوئی سب ایڈیٹر کوشش نہ فرمائیں کیوں کہ یہ خود ہمارے پروپرائٹر صاحب کا انتخاب ہے۔ ہم نے شروع شروع میں ان سے پوچھا بھی تھا کہ صاحب اس مصرعے کا اخبار سے کیا تعلق ہے کہنے لگے اخبار کا نام آسمان ہے اور اس مصرعے میں بھی آسمان آتا ہے۔ ہم نے کہا بجا لیکن خاص

اس مصرعے میں کیا خوبی ہے؟ کہنے لگے علامہ اقبال کا مصرعہ ہے اور علامہ اقبال سے بڑھ کر شاعر اور کون ہے۔ اس پر ہم چپ ہو گئے۔ پیشانی پر اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بھی لکھا ہے، یہ میرا تجویز کیا ہوا ہے۔ اسے بھی بدلنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ عمر بھر کی عادت ہے، ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی، اپنے اخبار کی پیشانی پر ضرور لکھا۔

بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں کہ آتے کے ساتھ ہی ہمیں سے سوالات پوچھنے لگتے ہیں۔ ایک سوال بار بار دہراتے ہیں کہ آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہے؟ جیسے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیا ہے۔ ہماری پالیسی میں چند باتیں تو مستقل طور پر شامل ہیں مثلاً ہم عربوں حامی ہیں اور امریکہ سے ہرگز نہیں ڈرتے چنانچہ ایک دن تو ہم نے پریذیڈنٹ ٹرومین کے نام اپنے اخبار میں ایک کھلی چٹھی بھی شائع کر دی لیکن عام طور پر ہم پالیسی میں جمود کے قائل ہیں اسی لیے سب ایڈیٹر کو مسلسل ہم سے ہدایات لینی پڑیں گی۔ ہفتہ رواں میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ پنڈی کیمپ کے ہیڈ ماسٹر کو موسم سرما سے پہلے پہل یا ترقی دلائی جائے یا ان کا تبادلہ لاہور کرایا جائے (ان کے لڑکے کی شادی ہمارے پروپرائٹر کی لڑکی سے طے پا چکی ہے اور خیال ہے کہ موسم سرما میں شادی کر دی جائے)۔

انشا کے متعلق ہمارا خاص طرز عمل ہے اور ہر سب ایڈیٹر اور مترجم کو اس کی مشق بہم پہنچانی پڑے گی۔ مثلاً پاکستان بنا نہیں معرض وجود میں آیا ہے، ہوائی جہاز اڑتا نہیں محو پرواز ہوتا ہے، مترجموں کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک مترجم نے لکھا کہ کل مال روڈ پر دو موٹروں کی ٹکر ہوئی اور تین آدمی مر گئے۔ حالانکہ انہیں کہنا چاہیے تھا کہ دو موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہوا جس کے نتیجے کے طور پر چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے مہلک طور پر مجروح ہوئے۔

لاہور کارپوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پالتو کتے کے گلے میں پیتل کی ایک ٹکیہ لٹکانی ضروری ہے جس پر کمیٹی کا نمبر لکھا ہوگا۔ ایک مترجم نے یہ ترجمہ یوں کیا کہ ہر کتے کے گلے میں بلا ہونا چاہیے حالانکہ کارپوریشن کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں ایک دوسرا جانور لٹکا دیا جائے۔

سینما کے فری پاس سب ایڈیٹر کے مشاہرے میں شامل نہیں۔ یہ پاس ایڈیٹر کے نام آتے ہیں اور وہی ان کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ فی الحال پروپرائٹر اور ان کے اخبار میں ضرورت ہے

اہلِ خانہ کے کام آتے ہیں لیکن عنقریب اس بارے میں سینما والوں سے ایک نیا سمجھوتہ ہونے والا ہے اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے ذریعے کسی سینما والے سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لی جائے تو بہتر ہوگا علیٰ ہذا جو اشیاء ریویو کے لیے آتی ہیں مثلاً بالوں کا تیل، عطریات، صابن، ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصفیہ کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا۔

ممکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لیے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہوگا۔ ہمارے پروپرائٹر اگرچہ دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اسٹاف بہت بڑھ رہا ہے اسٹاف بہت بڑھ رہا ہے اور اسی وجہ سے انھوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے عجب نہیں کہ جب ہم دفتر میں اکیلے رہ جائیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جائیں وہ اصولاً اسٹاف بڑھانے کے خلاف ہیں دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ سٹاف زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے یہ معلوم کبھی نہیں ہوا کہ کیا بات؟ کون سی بات اپنے ڈپو پر بھی وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ ورنہ بات باہر نکل جاتی ہے۔

اب اور تب

جب مرض بہت پرانا ہو جائے اور صحت یابی کی کوئی امید باقی نہ رہے تو زندگی کی تمام مسرتیں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ جاتی ہیں کہ چارپائی کے سرانے میز پر جو انگور کا خوشہ رکھا ہے اس کے چند دانے کھا لیے مہینے دو مہینے کے بعد کوٹھے پر غسل کر لیا گاہے گاہے ناخن ترشوا لیے۔

مجھے کالج کا مرض لاحق ہوئے اب کئی برس ہو چکے ہیں۔ شباب کا رنگین زمانہ امتحانوں میں جوابات لکھتے لکھتے گزر گیا۔ اور اب زندگی کے جو دو چار دن باقی ہیں وہ سوالات مرتب کرتے کرتے گذر جائیں گے۔ ایم اے کا امتحان گویا مرض کا بحران تھا۔ یقین تھا اس کے بعد یا مرض نہ رہے گا یا ہم نہ رہیں گے۔ سو مرض تو بدستور باقی ہے اور ہم۔ ہر چند کہیں کہ ہیں۔ نہیں ہیں۔

طالب علمی کا زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا، نرم نرم گدیلوں پر گزرا گویا بستر عیش پر دراز تھا۔ اب تو صاحب فراش ہوں۔ اب عیش صرف اس قدر نصیب ہے کہ انگور کھا لیا۔ غسل کر لیا۔ ناخن ترشوا لیے۔

تمام تگ و دو لائبریری کے ایک کمرے اور سٹاف کے ایک ڈربے تک محدود ہے اور دونوں کے درمیان کا ہر موڑ ایک کمین گاہ معلوم ہوتا ہے۔

کبھی راوی سے بہت دلچسپی تھی۔ روزانہ علی الصباح اس کی تلاوت کیا کرتا تھا اب اس کے ایڈیٹر صاحب سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں، کہ کہیں نہ کہیں سلام روستائی کھینچ ماریں گے۔ ہال میں سے گزرنا قیامت ہے۔ وہم کا یہ حال ہے کہ ہر ستون کے پیچھے ایک ایڈیٹر چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

کالج کے جلسوں میں اپنی دریدہ دہنی سے بہت ہنگامہ آرائیاں کیں۔ صدر جلسہ بننے سے ہمیشہ گھبرایا کرتا ہوں کہ یہ دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ والا معاملہ ہے اب جب کبھی جلسہ کا سن پاتا ہوں ایک خنک سا ضعف بدن پر طاری ہو جاتا ہے ——— جانتا ہوں کہ کرسی

صدارت کی سولی پر چڑھنا ہوگا اور سولی بھی ایسی کہ انا الحق کا نعرہ نہیں لگا سکتا۔

قاضی صاحب قبلہ نے اگلے دن کالج میں ایک مشاعرہ کیا۔ مجھ سے بدگمانی اتنی کہ مجھے اپنے عین مقابل ایک نمایاں اور بلند مقام پر بٹھا دیا اور میری ہر حرکت پر نگاہ رکھی۔ میرے اردگرد محفل گرم تھی اور میں اس میں کنچن جنگا کی طرح اپنی بلندی پر جا بیٹھا تھا۔

جس دن کالج میں تعطیل ہوا کرتی مجھ پر اداسی سی چھا جاتی۔ جانتا کہ آج کے دن تہمد پوش، تولیہ بردار، صابن نواز ہستیاں دن کے بارہ ایک بجے تک نظر آتی رہیں گی۔ دن بھر لوگ گنّے چوس چوس کر جا بجا پھوگ کے ڈھیر لگا دیں گے۔ جو رفتہ رفتہ آثارِ صنادید کا سا مٹیالا رنگ اختیار کر لیں گے۔ جہاں کسی کو ایک کرسی اور سٹول میز آ گیا وہیں کھانا منگوا لے گا اور کھانا کھا چکنے پر کوؤں اور چیلوں کی ایک بستی آباد کرتا جائے گا تاکہ دنیا میں نام برقرار رہے۔

اب یہ حال ہے کہ مہینوں سے چھٹی کی تاک میں رہتا ہوں جانتا ہوں کہ اگر اس چھٹی کے دن بال نہ کٹوائے تو پھر بات گرمی کی تعطیلات پر جا پڑے گی۔ مرزا صاحب نے اپنی کتاب واپس نہ لایا تو وہ بلا تکلف ہضم کر جائیں گے۔ مچھلی کے شکار کو نہ گیا تو پھر عمر بھر زندہ مچھلی دیکھنی نصیب نہ ہو گی۔

اب تو دل بستگی کے لیے صرف یہ باتیں رہ گئی ہیں کہ فورتھ ایر کی حاضری لگانے لگتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس دروازے کے پاس جو نوجوان سیاہ ٹوپی پہنے بیٹھے ہیں اور اس دروازے کے پاس جو نوجوان سفید پگڑی پہنے بیٹھے ہیں۔ حاضری ختم ہونے تک یہ دونوں جادو کی کرامات سے غائب ہو جائیں گے۔ اور پھر ان میں سے ایک صاحب تو ہال میں نمودار ہوں گے اور دوسرے بھگت کی دکان میں دودھ پیتے دکھائی دیں گے۔ آج کل کے زمانے میں ایسی نظر بندی کا کھیل کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یا صاحبِ کمال کے کرتب کا تماشا کرتا ہوں جو عین لیکچر کے دوران میں کھانستا کھانستا یک لخت اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیماروں کی طرح دروازے تک چل کر وہاں سے پھر ایسا بھاگتا ہے کہ پھر ہفتوں سراغ نہیں ملتا۔ یا ان اہلِ فن کی داد دیتا ہوں جو روز ذرا دیر سے آتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنی حاضری لگوا لیتے ہیں کہ صاحب غریب خانہ بہت دور ہے۔ جانتا ہوں کہ دولت خانہ ہوسٹل کی پہلی منزل پر ہے لیکن منھ سے کچھ نہیں کہتا۔ میری بات پر یقین انہیں بھلا کیسے آئے گا۔ اور کبھی ایک دو منٹ کی فرصت نصیب ہو تو دل بہلانے کے لیے یہ سوال کافی ہے کہ ہال کی گھڑی مینار کی گھڑی سے

تین منٹ پیچھے ہے دفتر کی ہال کی گھڑی سے سات منٹ آگے ہے چپڑاسی نے صبح دوسری گھنٹی مینار کے گھڑیال سے پانچ منٹ پہلے بجائی اور تیسری گھنٹی ہال کی گھڑی سے نو منٹ پہلے تو مرکب سود کے قاعدے سے حساب لگا کر بتاؤ کہ کس کا سر پھوڑا جائے۔

وہی میں نے کھانا کھایا، انگور کھالیا، غسل کرلیا، ناخن ترشوا لیے ؎

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی

اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

(راوی ۱۹۲۹ء)

دوست کے نام

از لاہور

اے میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنون لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا انتظام کرے گی۔ واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے کرتا دھرتا کون اہلِ جنون ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بے انتہا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوق صحیح رکھتے ہیں اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے۔ بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو اور آپ ہی نے اپنی جاذبیت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطے پر جمع کر دیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا سا شغف نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا کیونکہ اپنے ہم خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور یک گونہ تقویتِ قلب نصیب ہو گی۔ ورنہ تن تنہا کتابوں اور تصویروں سے راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے، ذوقِ سلیم کی نازکی پر تنہائی کی وحشت اور تلخی غالب آنے لگتی ہے، انسان دیوانہ نہیں تو علیل دماغ ضرور ہو جاتا ہے اور غالب کا ایک مصرعہ قافیہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ "مقدور ہو تو ساتھ رکھوں راز داں کو میں"۔

لیکن اے دوست! کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے جل کر نہیں لکھا کہ پاکستان پر ابتلا کا زمانہ آیا ہوا ہے۔ اور آپ جیسے خوش فکروں کو مصوری اور نقاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر روما اور نیرو کی سارنگی کا فقرہ نہیں کسا؟ کسی "ستون چشم بد دور ہیں آپ دیں گے" نے مسجد میں وعظ کرتے ہوئے آپ کے لہو و لعب اور تفریح کوشی پر نفرین نہیں کہی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتوے لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی گھاگس

مصلحت بین افسر نے ہمدردی اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا! کہ برخوردار ے

بانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا ضیافت کے موقع پر کسی نیم تعلیم یافتہ ہمعصر نے، جو تنخواہ میں آپ سے برتری کا دعوے دار ہے، آپ کی آزادہ روشی کا مضحکہ نہیں اڑایا اور جب آپ پیے ہوئے نظر آئے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوئے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش نہیں آئیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہو گی یا پھر بیزاری اور بددلی پک رہی ہو گی اور آپ کو ابھی دکھائی یا سنائی نہ دی ہو گی ورنہ جس حسنِ مذاق پر آپ کو غرّہ ہے وہ تو آج کل ایک مہاجر یتیم کی طرح بھوکا اور ننگا کسی کھنڈر کے کونے میں سر بزانو دبکا بیٹھا ہے اور باہر بڑا اثرمیہ برس رہا ہے۔ اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

پچھلے سال قائدِاعظم یہاں تشریف لائے۔ اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے اس میں جو قطعہ رُز گارڈن کہلاتا تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن، جو پاکستانی لاہور کا پہلا جشن کا دن تھا۔ روز گارڈن کا نام "گلستانِ فاطمہ" رکھا گیا۔ اور یہ نام ایک بورڈ پر لکھ کر باغ میں جو چھوٹی سرخ اینٹوں کی خوب صورت محراب استادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت ایسی کریہہ اور طفلانہ تھی۔ کہ مدرسہ کے لڑکوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لٹکاتے ہوئے شرم آتی۔ "گلستان فاطمہ" کی بے ذوق ترکیب سے قطع نظر کیجیے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجیے..... جس کی بدولت نہ وہ غریب ہی اس نام سے مانوس ہوں گے جو دوپہر کے وقت درختوں کے سایے میں اپنا گرد آلود جوتا سر کے نیچے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں۔ نہ وہ پتلون پوش ہی اس میں کوئی کشش پائیں گے۔ جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں ٹینس کھیلنے آتے ہیں۔ لیکن جب ان جلوے کی پیاسی گنہگار آنکھوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر منقوش دیکھا تو نظر اور دل دونوں مجروح ہوئے۔ کیونکہ ایسے شان دار موقع کے لیے اس بد صورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آ سکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم وہ قوم جو کئی پشتوں سے فن خوشنویسی کی علمبردار ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صناعی اور ہنرمندی سے لکھے کہ کاتبِ قدرت نے بھی ان کو آفریں کہا ہو گا۔ پنجاب کا خطہ وہ خطہ جسے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لاہور کا شہر وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوشنویس رہتا ہے

دوست کے نام

اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استادِ فن پیدا ہوئے اس پر یہ حال کہ اس تقریب سعید پر اس شہر میں، مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھنے پڑیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہوں اور نشست بے ڈھنگی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں بدمذاقی کا عروج نظر آتا اور آپ پژمردہ ہو جاتے اور ڈھونڈھتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں۔ اور لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی خردہ گیری پر آپ کو بدتمیز کہتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن سمجھیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پر پاکستان میں کیڑے ڈالنے کا الزام لگتا اور آپ کی وفاشعاری پر حرف آتا۔

اب آپ اس انجمن کے جگر میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم جمع ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں دردمند دل رکھتے ہیں یہ کہنے سے کیوں کر باز رہیں گے کہ اے مسلمانو! تمھارے آباو اجداد خط اور دائرے اور خم اور زاویے کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے کوئی اور طرز، نستعلیق اور نسخ، کس کس نہج سے انھوں نے ابجد سے عشق کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو، ان کے مطلا اور مذہب نسخوں کو دیکھو، ان کے روضوں اور محلوں، ان کی مسجدوں اور خانقاہوں، ان کے فرامین اور سکوں اور مہروں، ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو، مرگ یا زیست کا کوئی مقام، سطوت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا جلوت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انھوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے لافانی نقوش چوب و قرطاس و سنگ پر ثبت نہ کر دیے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمھیں اپنے کلچر کے احیا و تحفظ کے لیے سب قوتیں تمھارے ہاتھ میں دے دی ہیں قسمیں کھاؤ کہ اس ورثے کو ہاتھ سے جانے نہ دو گے اور عہد کرو کہ آج سے تمھاری دکانوں، تمھارے مکانوں، تمھارے دفتروں، تمھاری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں، تمھاری مسجدوں اور تمھارے مزاروں، تمھارے سرناموں اور تمھارے نوٹس بورڈوں پر جہاں جہاں تمھارے ہاتھ ابجد کے نقش کھینچیں گے اسلاف کا نام روشن کریں گے۔ اور جو نزاکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انھوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں انھیں مسخ نہ ہونے دو گے تاکہ جہاں کسی کو تمھاری تحریر نظر آئے وہ جان لے کہ اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش خطی کا مرتبہ بلند کیا اور جو اب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے۔

یہ کہنے سے آپ کیونکر باز آئیں گے؟ لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں

ہیں ایسے لوگ؟ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے۔

اور پھر خوش نویسی تک تو عافیت رہے گی لیکن کیا آگے بھی بڑھئے گا؟ تصویروں کا ذکر بھی کیجیے گا؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے تو اے دوست وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیے گا۔ کیونکہ اگر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بے انتہا جسارت سے کام اور عجب نہیں لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔ لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چٹکی چٹکی بھر پھینک دی گئی اور اس معجون کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک یورپین خاتون میسر ہیں جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں۔ وہ کہیں ادھر ادھر ہو گئیں اور کوئی عورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام خدانخواستہ کسی مرد کے سپرد ہوا تو زلزلے نہ آجائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا حلیہ بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو تہ کر کے رکھ دی گئی ہے کیونکہ ہو تو بھلا کسی کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستخط سے یہ لکھوا بھیجے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے؟ باقی رہی تصویر کشی تو ایک ملنے والے اگلے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے کہلوا بھیجا ہے کہ ہماری لڑکیاں جاندار دوں کی شکلیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب، ناشپاتی، مرتبان یا پہاڑ دریا، جنگل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی۔ شریعت کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں تو ہرگز جائز نہیں فوٹو البتہ جائز ہے وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ ہو بہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور سرایت کر جاتا ہے کسی نے کہا فوٹو بھی تو کئی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹو گرافر بھی تو بڑے فن کار ہوتے ہیں جواب ملا کہ جا بجا دستی اور تکلف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ غرضیکہ ان کے نزدیک اسی ایک فوٹو گرافر کا کام حق و راستی کا آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا

گھر کے باہر جا کر آئنے میں تصویر کھینچتا ہے بہرحال تو جان دار اشیاء کا ہے باقی رہے جنگل، پہاڑ، دریا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی کوتوال حق بین مصوروں کے "جھوٹ" کو گردن سے جا دبوچے گا۔ اور آپ چیختے اور سسکتے رہ جائیں گے کہ یہ تو ون گوگ ہے! یہ تو بہت بڑا آرٹسٹ ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ دی جائے گی۔

ان حالات میں چغتائی کا امکان بہت کم ہے، کوئی بات "سچ" بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں؟ درخت تک تو مجنوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی۔ غزال چشم، سینہ چاک اور بعض اوقات محرم کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں تسمے، ڈوریاں، پھندے بہت ہوتے ہیں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تسمہ یا ڈوری لیلےٰ کے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے سازوسامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت ضرور نظر آتی ہے وہ یہ کہ لے دے کے یہی ایک ہمارا مصور ہے اسے دفن کر دیا تو یہ دبا فوراً تھم جائے گی! اور ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے گی۔ باقی رہی مغلوں کی قدیم تصویریں یا ایرانی مصوروں کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی انڈیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کیے جا سکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہو گی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کراچی کون سا ایسا جزیرہ ہے اور کون سے گم شدہ براعظم میں واقع ہے کہ ارد گرد کے سمندر کی کوئی لہر وہاں تک نہ پہنچ سکے گی؟ آپ کو تعمیر اور تخلیق کی سوجھ رہی ہے لیکن یہاں تو تخریب کا دور دورہ ہے۔ ہاتھوں سے اٹھ چھین کر ان کی جگہ قلم اور موقلم آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سا جذبہ پیدا کیجیے آپ کے دیکھتے دیکھتے وہ تخریب کی راہ اختیار کر لیتا ہے لوگ جس چیز کا نعرہ لگا کر اٹھتے ہیں سب سے پہلے اسی چیز کا خون کر بیٹھتے ہیں۔ آپ کہیے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ قیلیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ لال کریں۔ آپ اسلام کی دعوت دیجیے تو تلاشی شروع ہو جاتی ہے کہ کس کس قوم کا دین ہے؟ کسے سنگسار کریں؟ آپ حیا کی تلقین کیجیے تو لوگ سر بازار عورتوں کے منہ پر تھوکنے لگتے اور بچوں پر اپنا بھاؤ [illegible]

بچوں کو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی

اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

ایسے غیظ و غضب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ پنپا ہے؟ آرٹ کے لیے تو ضبط اور نسق اور استحکام اور اخلاق اور فراغ لازم ہیں یا پھر کوئی ولولہ، کوئی امنگ، کوئی عشق جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شعر و سخن، نغمہ و رنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں کیا کبھی آرٹ ایسے میں بھی پنپتا ہے؟ کہ ہر بڑے کو دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرہ کر رکھا ہو اور ہر چھوٹا اپنی بے بضاعتی کا بدلہ ہر ہمسائے اور راہگیر سے لینے پر تُلا ہوا ہو نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو اور لوگ فاقے کے ڈر سے نجات پا کر قناعت کی گود میں ذرا آنکھ جھپک لیں نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہو نہ مسرت کا کوئی ایسا جھونکا آئے کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں۔ نہ عافیت کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں آپ کا فنکار معتکف ہو کر بیٹھ جائے اور آپ کے لیے تصویریں بناتا رہے، نہ آس پاس کوئی ایسی بستی ہو جہاں شاعر غریب شہر بن کر گھومتا پھرتا رہے اور لوگ اسے دیوانہ اجنبی سمجھ کر اسے ہک لینے دیں۔ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویروں کو مخرب اخلاق اور عریاں کہہ کر جلا دیا جائے، چند مصوروں پر بے ادبی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ یا پھر ان پر ایسے لوگ مسلط کر دیے جائیں جو ان کے ہنر کو کھردری سے کھردری کسوٹیوں پر پرکھیں اور ان پر واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعوے تھا اس کا دور اب گزر گیا۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت نہیں سمجھتے، اسے محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے آپ ایسے بھی نہیں کہ آپ کو جانداروں ہی کی تصویر پر اصرار ہو یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔ حسن کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے، جو شکل چاہے اختیار کرے، صرف یہ ہے کہ زندہ ہو اور امیر غریب، چھوٹے بڑے، ادنے اعلے سب پر اپنی نعمتیں ارزانی فرمائے۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ آپ تو اُس عہدِ زریں کو واپس لانا چاہتے ہوں گے تاکہ آرٹ کو بندہ بچوں کے کھلونوں میں کساں

کے تہمد میں، بیلانی کے ہاتھ کی چھڑی میں، بہاری کے مٹی کے گھڑوں میں غرض زندگی کے ہر گوشے میں نور پاش ہو۔ لیکن جو ننھی ننھی شمعیں یہاں وہاں ٹمٹما رہی ہیں، انہیں ہی بجھا دیا گیا تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں، جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں، وہ کیسے جگمگائیں گی؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلیس ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجیے کہ آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے لیے انہیں اس بیگانہ تبسم ماحول میں کئی صحرا چھاننے پڑیں گے۔

فرشتے نیست کہ در پہلوے آں صد غم نیست
روزِ مولود جہاں کم ز شب ماتم نیست

اگر یہ محض میرا وہم ہے تو اے دوست پھر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی تو پھر اے دوست ہم سب کو وہاں بلا لیجیے یا کراچی کو اتنا وسیع کیجیے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ پیدا کر لیا ہوگا۔ آپ کے اخلاص اور اصابت رائے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں سے آپ کی ملاقات ہوگی، بڑے بڑے ارباب حل و عقد کا قرب نصیب ہوگا۔ ان سے کہیے کہ ؎

منزل راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے

(نقوش جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء)

غنچۂ تبسم کے دیباچوں پر ایک نظر

حال ہی میں تمکین کاظمی صاحب کے مضامین کا مجموعہ موسومہ بہ "غنچۂ تبسم" حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ کتاب کے شروع میں پانچ دیباچے ہیں۔ ایک دیباچہ کاظمی صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہے باقی چار دیباچے چار دیگر نابغۂ روزگار کے قلم سے ہیں۔

کچھ عرصہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دیباچوں کا مرض ہندوستان میں بڑھ رہا ہے۔ ملا کتاب شائع کرتا ہے تو حاجی اس پر دیباچہ لکھتا ہے۔ حاجی قلم اٹھاتا ہے تو ملا اس کا تعارف کراتا ہے۔ مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ من ترا ملا بگویم تو مرا حاجی بگو۔ یہاں تک تو خیر کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں ابھی تک جہلا کی کثرت ہے اور ہمارے اہل قلم اتنی دقیق باتیں لکھتے ہیں کہ جب تک ایک مصنف کے نکات، اسی پائے کا دوسرا مصنف بحوالہ اشاعت لوگوں کے سامنے حل کر کے نہ رکھ دے بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے فیض سے محروم رہ جاتی ہے۔ لیکن "غنچۂ تبسم" کے ایک نسخے کے ہمراہ چار چار حکمائے زبان کا پرچۂ ترکیب ارسال کرنا زیرے کے منہ میں اونٹ کے برابر ہے۔ تمکین کاظمی صاحب کے نام اور ان کے ادبی کارناموں سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی کم و بیش واقف ہے، کیا ان کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ جب تک چار آدمی انہیں کندھا نہ دیں وہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے؟

اور پھر دیباچے بھی ایسے کہ ان سے نہ تو تمکین صاحب کی شانِ سخن طرازی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ دیباچہ نویسوں کی شان سخن فہمی ہی دوبالا ہوتی ہے۔ البتہ فطرت انسانی کے اس اہم اصول پر روشنی ضرور پڑتی ہے ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یہ شروع شروع میں شیخ سعدی کی آڑ ہم نے اس لیے لی کہ ہم بہر حال ناظرین و قارئین کے

کثیر التعداد گروہ کے چند غیر معروف افراد ہیں اور دیباچہ نویس حضرات بہرحال اہلِ قلم، لہٰذا خدا کے بعض برگزیدہ بندوں میں سے ہیں ورنہ جو بات اس شعر میں شیخ سعدی کہہ گئے ہیں ہم اپنے الفاظ میں زیادہ تحقیق، زیادہ زور اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والے ہیں۔

پہلا دیباچہ تمکین کاظمی صاحب نے بقلم خود لکھا ہے۔ لیکن اسے دیباچہ نہیں کہا۔ "سرآغاز" کا لقب عطا فرمایا ہے۔ دوسرے دیباچے کا نام "اعلام" تیسرے کا نام "تاثر" چوتھے کا نام "تعارف" اور پانچویں کا نام "تقریب" ہے۔ (ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ چھٹا دیباچہ نہ لکھوانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے اس طرح کا مقوی نام نہ مل سکا ہوگا۔ یہ ثقالت الفاظ کتاب میں جابجا پائی جاتی ہے۔ فہرست مضامین کو "مندرجات" لکھا گیا ہے کتاب کا تفسیری عنوان "مجموعۂ نگارشات فکاہی" ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جدت کے پیچھے یوں ہی ہاتھ دھوکے پڑنا تھا تو صفحے کی بجائے "چہرۂ قرطاس" اور ملنے کے پتے کی بجائے "سبیل ہائے اصول" اور قیمت کی بجائے "نذر" یا "ہدیہ" کیوں نہ لکھ دیا۔ اگر محض الفاظ کی دہشت ناکی سے مرعوب کرنا مقصود ہو تو پھر قاموس کے بعد پھر قاموس کے بعد کسی اور کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے البتہ اگر ان عنوانات میں یہ خوبی ہے کہ ہر ایک کے اعداد سے کتاب کی تاریخ نکلتی ہے تو مجبوری ہے۔

ہاں تو ہم تمکین صاحب کے "سرآغاز" کا ذکر کر رہے تھے۔ چار دیباچوں میں اپنی تعریف کروا لینے کے بعد بھی تمکین صاحب کی تسکین نخوت نہ ہوئی تو انھوں نے خود قلم اٹھایا شروع میں تو لکھ دیا کہ "بنام خداوند بخشائش گر مہرباں" لیکن اللہ کا نام لینے کے بعد سنبھالا اور تین صفحوں تک انا الحق ہی کہتے چلے گئے۔ جابجا تاریخوں کا حوالہ ساتھ ساتھ دیا ہے تاکہ زمانۂ آئندہ کے مورخ کو کوئی دقت پیش نہ آئے "۱۹۲۷ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۳۰ء اور اوائل ۱۹۳۱ء میں مصروف زیادہ رہنا پڑا اور اوائلِ ۱۹۳۱ء اور اوائلِ ۱۹۳۱ء ..." مدیران رسائل نے مضامین کے لیے مارے تقاضوں کے ناک میں دم کر دیا۔" آگے چل کر فرماتے ہیں:

"بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوگا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً کسی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

یہ جا بجا کوشش کے لفظ پر ہم نے خط خط اس لیے کھینچ دیے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ تمکین صاحب نے کتنی دفعہ اور کس خوب صورتی سے کوشش کی ہے۔ مساعی جمیلہ غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ اگر تمکین صاحب اسی طرح کی ٹھیٹھ اردو لکھنے پر مصر ہیں تو ہم ان کو یہی مشورہ دیں گے کہ "زرا لنگ دکھن تیز کھینچ بول" لیکن تمکین صاحب کی انانیت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اس طرح کی گل افشانی کے بعد بھی فرماتے ہیں :-

"میری مادری زبان اردو ہے اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے"

نہ صرف یہ بلکہ کہتے ہیں!

"میں چاہتا تو ٹھیٹھ یو پی کے محاورات استعمال کر سکتا تھا"

اس تبحر علمی اور اس قادر الکلامی کے باوجود صرف ایک فقرے میں اتنی کوششیں بلکہ کاوشیں کرنے کی ضرورت پھر آخر کیوں پیش آئی؟

تمکین صاحب نے اپنی کتاب میں کئی دکنی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کے متعلق دیباچے میں فرماتے ہیں :-

"بعض احباب کا خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگائی جائے مگر میں اس بدذوقی کا مخالف ہوں۔ جنھیں ضرورت ہو گی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لیں گے یا مجھ سے دریافت کر لیں گے"

الحمد للہ کہ آپ کو بھی خوش مذاقی کا خیال آیا۔ کیوں حضرت ایک کتاب کے چار چار دیباچے بدمذاقی نہیں؟ ہر دیباچہ میں اپنی تعریف بلکہ بعض اوقات اپنی ڈائرکٹری تک چھپوا دینا بدمذاقی نہیں؟ ہر نوٹ میں بار بار اپنی طرف اشارہ کرنا بدمذاقی نہیں؟ لیکن جو الفاظ کسی لغت میں نہ پائے جاتے ہوں ان کے معنی بتا دینا بدمذاقی ہے۔ کیا آپ کا کوئی ایسا دوست نہ تھا جو یہ کام بھی کر دیتا۔ جہاں اتنے گوناگوں دو قلموں عنوان قائم کیے تھے وہاں دکنیات کا ایک اور عنوان بھی بڑھا دیتے۔ باقی رہی آپ کی خوش مذاقی سو اس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ اپنے کاتب کے متعلق فرماتے ہیں کہ زود نویس ہیں مگر،

"حد درجہ غلط نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں جنھوں نے املے کی غلطیوں کے علاوہ جملے کے جملے چھوڑ دیے"

دل کی بھڑاس بھی نکالی تو بے چارے کاتب پر جسے عالم ہونے کا دعوے نہ فاضل

ہونے کا اور رغدرے کے واسطے یہ تو بتایے کہ یہ "املے کی غلطیوں" جو آپ نے لکھا ہے تو یہ کاتب نے غلط کتابت کی یا آپ نے دکنی انشے کے اصولوں کے مطابق لکھا؟ اور کاتب صاحب کی کم سوادی کو آخر آپ کہاں کہاں پیش کرتے پھریں گے۔ کیا ارنسٹ کے ترجمے میں "ایمجن" کو ہر جگہ ایگزمان لکھنا بھی انہی کے سر تھوپے گا؟ کم سوادی کوئی ایسی خاص صفت نہیں کہ صرف کاتبوں ہی میں پائی جاتی ہو۔

مولانا نیاز فتحپوری کے "اعلام" کے متعلق ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں اور کیا کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ تین مختصر صفحوں کے اندر انھوں نے اپنی کم علمی پریشان خیالی اور غلط نگاری کی اتنی مثالیں جمع کر دی ہیں کہ اس سے بہتر جامعیت کی مثال اردو میں مشکل سے ملتی ہے۔ دیباچے کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

"غنچہ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نکاہات کے سلسلے میں انھوں نے لکھے ہیں چونکہ میں طنزیات اور مزاحیات دونوں کو نکاہات میں شامل کرتا ہوں اس لیے میرا مقصود یہ ہے کہ دونوں رنگ کے مضامین اس مجموعے میں نظر آتے ہیں۔"

نیاز صاحب خود ہی بتائیں کہ "ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نکاہات کے سلسلے میں انھوں نے لکھے ہیں" کتنا بھونڈا فقرہ ہے "سلسلے" کا لفظ جس طرح سے انھوں نے استعمال کیا ہے انتہا درجے کے عجز بیان کی دلیل ہے ہم اصلاح کے ذمہ دار نہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پہلے فقرے کو یوں لکھنا چاہیے تھا۔

"غنچہ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے فکاہی مضامین کا مجموعہ ہے"

اور یہ جو طنزیات اور مزاحیات کو نکاہات میں شامل کرکے اتنے بڑے بڑے جمادات سے ہم حیوانات کے سر پھوڑنے کی کوشش فرمائی ہے، اس پر ہمیں ایک کہانی یاد آئی علم ریاضی کے ایک پروفیسر اپنی ماما پر ناراض ہوئے۔ دل غصے سے بھرا ہوا تھا لیکن چونکہ کبھی گالی دینے کی عادت نہ تھی اس لیے اظہار ناراضگی کے لیے موزوں الفاظ نہ ملے لیکن ماما کو ڈانٹنا بھی لازم تھا چنانچہ جھنجھلا کر بولے "تم بڑی مثلث متساوی الاضلاع" ماما بےچاری دبک کر رہ گئی۔

یہی حال نیاز صاحب کے اس فقرے کا ہے۔ جب انھوں نے نہایت زنا ے

سے کہہ دیا کہ میں الفاظ کو ترجمہ میں شامل کرتا ہوں، تو کسی کی اب کیا مجال کہ کچھ بولے۔ نیاز صاحب نے اپنے دماغ پر آنچ بھی نہ آنے دی اور یہاں علم و فضل کا رعب بھی پڑ گیا۔ خود ہی اصطلاحات گھڑیں۔ ان کے مفہوم کو بھی اپنے بطن کے اندر ہی رہنے دیا۔ اور جس میں جس کو بھی چاہا شامل کرتے رہے۔ اگلا فقرہ ملاحظہ ہو۔

"اس وقت یورپ کا کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس میں یہ مخصوص طرزِ تحریر (یعنی ہیومر) مقبول نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ تنقید کہ اس کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو"

(کیوں حضرت یہ یورپ کا ذکر بھی آپ رعب ڈالنے کے سلسلے میں کر گئے؟) اگر علم کے لفظ کا استعمال نیاز صاحب نے غلط نہیں کیا تو یقیناً فلسفہ، ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، کیمیا، جغرافیہ، طبیعات، سبھی چیزیں شامل ہیں۔ خدا جانے نیاز صاحب کو ان علوم کی کون سی ایسی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جو لطیفوں اور چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں؟ باقی رہی تنقید۔ نیاز صاحب کا ارشاد ہے کہ ظرافت کے بغیر اس کی تکمیل ہی ناممکن ہے۔ گویا اگر ایک بھی قابلِ قدر نقاد ہم انہیں ایسا بتا دیں جو ظرافت سے عاری ہو تو ان کا دعوائے پوچ ثابت ہو جائے گا۔ چونکہ نیاز صاحب کا فقرہ اس وقت سے شروع ہوا ہے اس لیے ہم صرف دورِ حاضرہ اور اختصار کی غرض سے صرف انگریزی کے نقادوں کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ ان میں سے ٹی ایس ایلیٹ، ورجینیا وولف، کیتھرین منسفیلڈ، مڈلٹن مرے، پروفیسر گیرڈ، ولسن نائٹ وغیرہم کی تصانیف خاص طور پر مستند مانی جاتی ہیں۔ اگر نیاز صاحب ان ناموں سے آشنا ہیں تو وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون مزاحیہ نگار ہے؟ یہ فہرست ادبی نقادوں کی تھی۔ لیکن نیاز صاحب کی مراد شاید سوشل نقادوں سے ہے۔ ایچ جی ویلز نے موجودہ سوسائٹی کی تنقید میں بیسوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ معدودے چند کو چھوڑ کر باقی کسی میں ظرافت کا گہرا کیا ہلکا سا رنگ بھی نہیں پایا جاتا۔ اور برٹرنڈ رسل، جو دنیا کے مشہور فلاسفروں میں سے ہے اور جس نے موجودہ سوسائٹی پر کئی پہلوؤں سے نکتہ چینی کی ہے، بھولے سے بھی کبھی مزاحیات میں قدم نہیں رکھتا۔ نیاز صاحب نے جو اتنی بڑی بات منہ سے نکال دی اور یورپ اور یورپ کا ہر شعبہ علم اور تنقید اور تنقید کی تکمیل ہر بات میں اتنی ٹانگ اڑا دی تو وہ کن جہال کو اپنا مخاطب بنا رہے تھے؟ ایسی باتیں

تو دوستوں کی صحبت میں کرلینی چاہئیں۔ ان کو سپردِ قلم کر کے تمام ہندوستان میں ان کی نشر و اشاعت کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔

یہ تو نیاز صاحب کے مطالعے کا حال تھا۔ اب ان کی انشا پردازی کا کمال ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:۔

"جناب تمکین کاظمی نے حال ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انکشاف ابھی ہوا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب (یعنی ظرافت نگاری) پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

یہ "پر" آپ نے خوب لگایا۔ مراد یہ تھی کہ تمکین صاحب ہیومر لکھتے ہیں یعنی فقرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمکین صاحب ہیومر پر لکھتے ہیں (یعنی ہیومر پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں۔) فقرہ بہرحال بھونڈا ہے یعنی اگر نیاز صاحب کے الفاظ میں کم سے کم تغیر و تبدل کر کے اصلاح دی جائے۔ تو یوں ہونا چاہیے تھا

"وہ اس صنفِ ادب میں بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں"

نہ یہ کہ وہ اس صنفِ ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اس صنفِ ادب "پر" لکھنے کی قابلیت تو خدا نے نیاز صاحب کو ہی عطا فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"نگاہی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیۂ جذبات کہلاتی ہے۔ سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔"

دوسرے فقرے میں دونو کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پہلے فقرے میں واحد کا صیغہ۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔ نیاز صاحب کا قول ہے کہ، جو محاورے یا اصطلاحات گہوارے سے کانوں میں پڑے ہیں ان کے خلاف اگر کوئی آواز کان میں آجاتی ہے تو تھوڑی دیر کے لیے سماعت مشوش ہو جاتی ہے۔ ہم نیاز صاحب کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی شیر خواری کے زمانے کو یاد کریں پھر اس فقرے کو پڑھیں اور پھر ہمیں بتائیں کہ ان کی سماعت کو تشویش محسوس ہوتی ہے یا ہر طرح سے خیریت معلوم ہوتی ہے؟ کیا یہاں "خوبی" کی بجائے "خوبیاں" اور "ہے" کی بجائے "ہیں" نہ ہونا چاہیے؟

لیکن اس بات کو جانے دیجیے یہ زبان کا مسئلہ ہے۔ اس میں ان اہلِ زبان ہی کو آپس میں نبٹنے دیجیے۔ جو صبح و شام اپنی زبان دانی کا ڈھول بجاتے رہتے ہیں فقرے کے مفہوم پر غور کیجیے۔ نیاز صاحب نفسیات کا ایک مسئلہ بیان کر گئے ہیں اور کمال

یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بیان کر گئے ہیں کس بھول پن سے فرماتے ہیں "نگاہی مضامین کی بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ کہلاتی ہے"! ("یہ کہلاتی ہے" کی بھی ایک ہی کہی یہ نہ بتایا کہ کون کہتا ہے۔ بس کہہ دیا کہ کہلاتی ہے خود بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے اور اس اجمال سے اثر بھی پیدا کر لیا کہ گویا ہم نے بڑے بڑے اہل الرائے کے خیالات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اب ہم تم ان پڑھ لوگوں کے سامنے کس کس فلاسفر کا نام لیں۔ تمھارے لیے اتنا کافی ہے کہ کہلاتی ہے) افسوس نیاز صاحب نے یہ نہ بتایا کہ نگاہی مضامین کی بڑی بڑی خوبیوں کی تخصیص انھوں نے کیسے کر لی؟ نہ انھوں نے کوئی مثال پیش کی ہے نہ دلیل اور بات اس دھڑلے سے کی ہے گویا چلتے چلتے فن تنقید کی شاہراہ پر ایک سنگِ میل ہی تو نصب کر گئے ہیں۔ ایسی بے سروپا بات کی تردید کوئی کس طرح کرے؟ البتہ اگر نیاز صاحب کبھی اس موضوع پر کوئی علاحدہ مضمون لکھیں اور اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ بشرطِ فرصت اس کا جواب ضرور لکھا جائے گا اتنا ہم ان سے کہے دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کا مضمون لکھنے سے پیشتر برگسوں کی کتاب موسوم بہ "خندہ" یا میریڈتھ کا مضمون ضرور کسی سے پڑھ لیں۔ کہ ان سے بہتر اس موضوع پر کم لوگوں نے لکھا ہے۔ حیرت ہے کہ نیاز صاحب یورپ کے ہر شعبۂ علم کو جانتے ہوئے بھی ان کتابوں سے ابھی تک واقف نہیں۔ یہ ہم نے اس لیے فرض کر لیا کہ انھوں نے ان دو مضمونوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو کم از کم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتے۔ ہم اور ہم جیسے کئی نو مشق ابھی مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پا رہے تھے کہ نیاز صاحب کا آفتابِ شہرت نصف النہار پر تھا۔ لیکن افسوس کہ اس کہنہ مشقی کے مقابلے میں انھیں اپنی ذمہ داری کا احساس بہت کم ہے۔ جن موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں ان کا دائرہ ماشاء اللہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ان کے شوقِ انشا پردازی کے ساتھ ساتھ ان کا علم بھی وسیع ہوتا رہتا یا کم از کم اگر وہ اپنے شوق کی جولانیوں کو اپنے دائرہ علم تک ہی محدود رکھتے تو بہت بہتر ہوتا۔

"تاثر" مولانا احسن مارہروی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے وہ یہ کہ مختصر ہے۔ شروع میں علم الاصوات کے ایک نہایت ہی سہل اور بیش پا افتادہ مسئلے کو (کہ لہجہ بدلے تو معنی بھی بدل جاتے ہیں) بڑے طمطراق کے ساتھ گلے کی رگیں پھلا پھلا کر اور ایک دو تین چار نمبر دے کر بیان کیا ہے اور سیدھی سادھی بات کو وہ الجھایا ہے کہ آشفتہ بیانی کو ہمیشہ کے لیے احسن مارہروی کا مرادف بنا دیا ہے! ابعد

اس مسئلے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہم انھیں کے الفاظ میں دہرائے دیتے ہیں (قارئین سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل فقرے کو ازحد غور سے پڑھیں) :-

"غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتب ترتیب میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اسکی تدریجی حالت علم تصنیف تالیف، سیاسی لکچر، ہندی مواعظ اور روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب تنوعات کے بعد تقریر تحریر کی متانت ظرافت ایک نوعیت خاص ظاہر کرتی ہے جو ہر ادبی زبان میں تفنن طبع کے لیے ضروری اور جزوِ لانیفک ہیں۔"

احسن صاحب علی گڑھ میں پروفیسر ادبیات ہیں۔ علی گڑھ میں نکتہ رس، قابل، ذہین اور زبان دان حضرات کی کمی نہیں۔ خدا کے لیے ان میں سے کوئی صاحب اس کاغانی زبان کا اردو میں ترجمہ کرکے ہمیں اس کا مطلب سمجھا دیں۔ ان دو فقروں میں صرف اور نحو کی کئی غلطیاں ہیں کئی الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے غلط ہے لیکن اس کو گنوانے سے کیا فائدہ؟ تمکین صاحب خود ہی فرمائیں کہ کیا وہ اس فقرے کا مفہوم سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو کیا انھوں نے خود ہی سمجھ لیا تھا یا کسی جوتشی سے اس کے معنی پوچھے ہیں۔ کیا سلاست، شگفتگی اور روانی اسی کا نام ہے؟ بہت ممکن ہے کہ ادبیات کے پروفیسر ایسی زبان لکھتے ہوں۔ بہرحال احسن صاحب کی قرینہ سنجی کے سامنے اگر ہر فقرہ اس زور سے زانوئے ادب تہ کرتا ہے کہ مطلب تو بچ کر باہر نکل جاتا ہے اور لفظوں میں گتھے پڑ جاتے ہیں۔ اسی انداز کے ایک دو صفحے لکھ کر پروفیسر صاحب نے دیباچے کا خاتمہ ایک شعر پر کیا ہے۔

ہے غنچۂ تبسم تمکین کاظمی
ایسا مذاق جس میں متانت ہے لازمی

جس طرح احسن صاحب پروفیسر ادبیات کے دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ مختصر ہے اسی طرح احسن صاحب تلمیذ حضرت داغ کے شعر میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ تقطیع سے نہیں گرتا ورنہ کیا دیباچہ اور کیا شعر۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔ احسن صاحب سے ہم اور تو کیا کہیں، صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اگر لازمی کا لفظ آنا ایسا ہی لازمی تھا تو کاظمی کو کازمی تو لکھ لیا ہوتا کہ اس سے شعر کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

دیباچہ نمبر ۳ ملا رموزی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ملا رموزی بھی تمکین صاحب کی طرح اپنے نام کے ساتھ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ضرور لکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ

کوئی علمی سند نہیں محض چندہ دیتے رہنے کی علامت ہے یعنی اگر ہندوستان میں افلاس نہ ہو تو بھیل، گونڈ تک سب ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ہو سکتے ہیں۔ اہلِ دانش کے نزدیک اس کی وقعت تو آر۔ ایس۔ وی۔ پی سے بھی کم ہے اور پھر یہ لوگ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس کے بعد خطوط وحدانی کے اندر لندن اس التزام سے لکھتے ہیں گویا خاص جارج پنجم کے دست مبارک سے سند پائی ہے۔ ان سے ہماری درخواست ہے کہ ابلہ فریبی کا یہ شیوہ ترک کر دیں اور نئے سال سے اپنے نام کے ساتھ یہ بے معنی حروف لکھنا چھوڑ دیں۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) لکھنے سے تو میٹرک (شکارپور) لکھنا زیادہ قدر افزائی کا موجب ہوگا۔

ملا رموزی صاحب کا دیباچہ بھی اسی بے ربطی کا آئینہ ہے جس کا اظہار انھوں نے اپنی لاہور والی تقریر میں کیا تھا۔ نیاز صاحب کی طرح ملا رموزی صاحب نے بھی ظرافت نگاری پر افکار کا عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ظریف تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع ہنسا دے جہاں ہنسنے کے لیے اس کا دل نہ چاہتا ہو۔ اور ظریف وہ جو حد سے سوا ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریف تحریر لکھ رہا ہوں"

ماشاء اللہ کیا حقائق کہے جناب نے! گویا ظریف تحریر وہ ہے جو پڑھنے والے کو ہنسا دے۔ (یہ نکتہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کنجِ عدم میں انتظار کر رہا تھا کہ بیسویں صدی میں ایک ملا رموزی پیدا ہوں گے جو اسے معرض ظہور میں لائیں گے) ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ میں ہنسا رہا ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہر بڑے سے بڑا بے وقوف، ہر نادان بچہ، ہر غلط سلط اردو بولنے والا انگریز ظریف ہے کیونکہ ان لوگوں کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم ہنسا رہے ہیں اور اگر ان کی باتیں بعینہٖ لکھ لی جائیں تو ہنسی کا سامان بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ملا رموزی دراصل کہنا کچھ چاہتے تھے منہ سے نکل کچھ گیا (بیان نویسوں میں یہ نقص اکثر پایا جاتا ہے) مطلب ان کا یہ تھا کہ ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن اس میں ہنسانے کی کوشش نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو۔ یہ معیار ایک حد تک صحیح ہے لیکن افسوس کہ ملا رموزی خود اس معیار پر پورے نہیں اترے۔ دیباچے کا پہلا ہی فقرہ پڑھیے

اگر کنوئیں کے برابر گہری اور تالاب کے برابر چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو ....؟

احسان کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس فقرے کو ظریفانہ فقرہ سمجھ کر ایک قہقہہ لگائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے اخلاق کی بہت بڑی آزمائش ہے۔

ملا رموزی صاحب بہت لکھنے کو انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی لیے اپنے اور تمکین صاحب اور سالک صاحب کے ح ہیں فرماتے ہیں۔

"ہم تو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون نگاری کے قائل ہوئے تو اسی لیے کہ انھیں جب دیکھا یہی کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں۔"

ملا رموزی صاحب نے خود بھی مدت سے یہی شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں۔ اس سے حضرت ضیا الملک کی نظر انتخاب بہت کمزور ہو گئی ہے۔ جب مضمون نگاری کا معراج یہی فرض کر لیا جائے کہ انسان روزانہ دو تین من مضمون لکھ ڈالے تو وزن پورا کرنے کے لیے ادھر ادھر کی بے ربط باتیں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ملا رموزی صاحب نے اس دیباچے میں کئی جگہ بد ذوقی کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ انھوں نے دیباچہ ظریفانہ رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ہے اس لیے ہم ایسی باتوں کو مذاق سمجھ کر ان سے درگذر کرتے ہیں۔ البتہ ایک بد ذوقی ایسی ہے کہ عذر ظرافت بھی اسے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا۔ انھوں نے سُہا صاحب کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، حد درجہ قابل نفریں ہے۔ کسی شخص کے جسمانی نقائص کی ہنسی اڑانا اور وہ بھی ایک کتاب کے صفحے پر کسی مہذب طبقے میں جائز نہیں۔ یہی بات ہے تو کل کو آپ اندھوں اور کانوں اور لولوں اور لنگڑوں کی بھی ہنسی اڑائیں گے۔ اور اپنی ظرافت نگاری پر فخر کریں گے۔ یہ ظرافت جہلا کی ظرافت ہے۔ شرفا کے لیے اور بے شمار باتیں ہنسنے اور طنز کرنے کو موجود ہیں۔ ان پر طبع آزمائی کیجیے فاضل الہیات کو کم از کم اخلاقیات سے تو واقف ہونا چاہیے۔

چونکہ یہ دیباچہ رموزی صاحب نے ظرافت آمیز رنگ میں لکھا ہے اس لیے تمکین صاحب کو خیال ہوا کہ ہم بھلا کیوں پیچھے رہ جائیں۔ جہاں جہاں رموزی صاحب نے کوئی مذاق کی بات کی وہیں آپ بھی نیچے ایک نوٹ دے کر دنیا کو یاد دلاتے چلے گئے کہ اس ہنسی مذاق میں کہیں ہمیں نہ بھول جائیے۔ ملا صاحب ظرافت نگار سہی، لیکن کتاب تو بہر حال ہماری ہے۔ ملا رموزی نے کہا "ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی کی صلاحیت ہے یا نہیں" آپ نے اس پر نوٹ چڑھا کر "قطعی صلاحیت نہیں ورنہ

ضرور آپ کو حیدر آباد بلاتا۔" (سخن سنج لوٹ لوٹ گئے۔ اہاہاہا) ملا صاحب نے کہا "آپ شیروانی کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟" آپ نے فوراً گلفشنیِ قلم سے جواب دیا کہ "بھئی کبھی کوٹ پتلون بھی پہنتا ہوں" (اہاہاہا) ملا صاحب نے کہا:

"ان مضامین کو حاصل کر کے دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جائیے"۔ آپ نے نوٹ ایزاد کیا کہ "مسلمانوں عبرت حاصل کرو"۔ (اہاہاہا) ملا صاحب نے کہا: "اللہ انھیں منصب دار بنا دے"۔ آپ نے جھٹ تصحیح کی کہ "آپ کی دعا سے منصب تو ہیں اب بھی ہے"۔ (غیر مرزبہ السحلال لوگ فوراً مرعوب ہو گئے۔) سبحان اللہ کیا ادبی پھلجڑیاں ہیں۔

"تقریب کے لکھنے والے مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بھی رنگیں صاحب و درطاز موزی کی طرح بھانگ دہل ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ہیں۔ ان میں صراحتہً انانیت باقی دیباچہ نویسوں کے مقابلے میں کم ہے لیکن کنایتہً دعائے علم میں یہ بھی ویسے ہی بلند آہنگ ہیں۔ زورِ قلم خود نمائی کی بہ نسبت دوست نوازی میں زیادہ صرف کیا ہے تاہم ایک رنگیں صاحب کی عظمت ثابت کرنے کے لیے وکٹر ہیوگو، ہربرٹ اسپنسر، میتھیو آرنلڈ، گارڈنر، رسکن لنکن اور امرسن کے اقوال نقل کر کر کے ان مشاہیر کو مفت میں رسوا کیا اور اپنے دوست کو نہایت نیک نیتی کے ساتھ مضحکہ انگیز بنا دیا۔ اقتباسات کے نقل کرنے میں سعیدی صاحب کو خاص ملکہ حاصل ہے میتھیو آرنلڈ کا قول نقل کیا تو وہ غلط (اور اس کے معنی بھی غلط سمجھے) اور لنکن کا قول نقل کیا تو وہ غلط۔

احسن مارہروی صاحب کی طرح سعیدی صاحب کا مذاقِ شعر بھی قابلِ ذکر ہے۔ غالب کا ایک مصرعہ نقل کیا کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" تو "حسن پرستی" کو "عشق پرستی" بنا دیا۔ اس کے علاوہ تین شعروں کو زینتِ کلام بنایا ہے پہلا شعر یہ ہے۔

ہتو شاباش کیا کہنا ترقی اس کو کہتے ہیں

نہ کرتے تھے تو پتھر تھے جو کرتے ہیں تو خدا ٹھہرے

دوسرا مصرعہ تو خیر پھر بھی گزارے کے قابل ہے لیکن پہلے مصرعے میں جیسے ہتھچوں سے بھرتی کی گئی ہے دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا

اسی کو اہلِ جہاں انقلاب کہتے ہیں

اگر سعیدی صاحب کو اسی پائے کے اشعار یاد رکھنے اور دہرانے کا شوق ہے تو مندرجہ ذیل

شعر بھی نوٹ کرلیں، کسی اور دیباچے میں کام آئے گا۔

ابھی سفید تھے بال اور ابھی سیاہ ہوئے
اسی کو لوگ عموماً خضاب کہتے ہیں!

تیسرا شعر البتہ اچھا ہے اور اس کے اچھا ہونے کی وجہ سے سعیدی صاحب کچھ ایسے مذبذب میں پڑ گئے کہ انھوں نے اس کے نیچے جھٹ توسین میں اقبالؔ کا نام لکھ دیا تاکہ پڑھنے والے سعیدی صاحب کو اس سے بری الذمہ سمجھیں۔

اس دیباچے کے پہلے حصّہ میں تمکین صاحب کے خاندانی حالات بالوضاحت بیان کیے گئے ہیں۔ ہم تمکین صاحب کے بزرگوں کو حد درجہ قابلِ احترام سمجھتے ہیں اور ان کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی منھ سے نکالنا پرلے درجے کی شقاوت۔ لیکن انہی کے احترام کی وجہ سے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ حصّہ حذف کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ آخر اولاد کے گناہوں کی سزا آباد اجداد کیوں بھگتیں اور پھر اچھی بات بھی بے محل کی جائے تو بری معلوم ہوتی ہے۔ تمکین صاحب آخر کہاں کے اتنے بڑے مصنف ہیں اور ان کی تحریرات ابھی بھی کیا خیال انگیز ہیں کہ پڑھنے والے ان کے خاندانی حالات بالوضاحت معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہو جائیں۔

دوسرے حصّہ میں سعیدی صاحب نے اردو کے مزاحیہ نگاروں پر فرداً فرداً تنقید کی ہے یا تنقید کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ سعیدی صاحب کے پاس خیالات کی قلت ہے اسی لیے بیچارے کسی کی تعریف کرتے وقت بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ تنقید کے تین چار نمونے ملاحظہ ہوں۔

(۱) اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حیدر نے اختیار کیا اور عمر گی سے لکھتے رہے۔

(۲) پطرس نے لائٹ ہیومر لکھا اور خوب لکھا۔

(۳) فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

(۴) امتیاز علی تاج صاحب نے بھی "چچا چھکن" کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھنے لگے۔

اس کے بعد ہم سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ حضرت آپ نے بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھا لیکن باوجود اس کم مائگی کے (یا شاید اسی کم مائگی کی وجہ سے) معمولی سی بات کو بھی عالمانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں مثلاً:

"اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس فن کو اردو میں

مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حیدر نے اختیار کیا"۔

اتنی ذرا سی بات کے معلوم کرنے کے لیے جس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا بچہ واقف ہے "اردو ادبیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا" کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہے۔ یہ شغل سعیدی صاحب ہی کو مبارک ہو! ایک اور جگہ غنی دو حتی یوں ادا کیا ہے:۔

"بہر حال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے"۔

ذکر تمکین صاحب کے مجموعۂ مضامین کا ہے لیکن فقرہ وہ استعمال کیا ہے جو اکثر پیغمبر بھی اپنے صحیفوں کے متعلق استعمال کرتے ہوئے تامل ہوں۔ سعیدی صاحب شاید "کامل" کے معنی نہیں جانتے انھوں نے اسے بھی "خوب" اور "عمدہ" کی قسم کا ایک معمولی لفظ سمجھ لیا ہے.....آخر میں سعیدی صاحب نے تمکین صاحب کے ساتھ حسد اور بغض رکھنے والوں کے خلاف جن کی تعداد بقول ان کے "بہت کافی ہو گئی ہے" بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ چونکہ ہم ان حاسدوں کے نام تک سے واقف نہیں، نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تمکین صاحب کے ساتھ رشک، اور حسد اور بغض رکھے۔ کیونکہ اس لیے ہمیں سعیدی صاحب کے زوردار فقروں میں بجز پڑھے پن اور سوئے ہضم کے اور کچھ نظر نہیں آتا مگر ہمیں سعیدی صاحب سے پورا اتفاق ہے۔ جو لوگ تمکین صاحب سے رشک کرتے ہیں ان کی دماغی حالت واقعی قابلِ افسوس ہے۔

خاتمے پر ہم نہایت واضح طور پر قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان پانچ حضرات سے معاذ اللہ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ عناد کیا معنی ہمیں تو افسوس ہے کہ ہمیں ملاقات تک کا شرف حاصل نہیں لیکن جب یہ پانچوں سوار ایک ساتھ میدانِ ادب میں اترتے ہیں اور باوجود اپنی زنگ خوردہ تلواروں اور اپنے فرسودہ ساز و سامان کے سمع خراش نعروں کے ساتھ مروجِ ادب اور مذاقِ سلیم کو دعوت مبارزت دیتے ہیں تو ہر عاقل و بالغ کا فرض ہے کہ اس دعوت کا جواب دے۔ ہماری اپنی رائے ان پانچ انشا پردازوں کی تصنیفات کے متعلق یہ ہے کہ بُرا بھی لکھتے ہیں اچھا بھی لکھتے ہیں، جب ہندوستان میں ادب انشا کی یہ حالت ہے کہ ہر بھلے بُرے کی کھپت ہو سکتی ہے تو ہم ان پر کیوں معترض ہوں؟ لیکن جب یہ لوگ تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اس وثوق کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کی نخوت کے بلبلے میں چھید کرنا ان پر احسان اور اردو خوانوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ تمکین صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی تو خاموشی، متانت اور شرافت کے ساتھ اسے بازار میں بیچ دیتے، صحیح آرا سے مستفید ہوتے، غلط آرا کو نظر انداز کر دیتے۔ یہ

غنچۂ بشر کے دیباچوں پر ایک نظر

ممکن نہ تھا کہ کم از کم اخلاقاً ہی اکثر پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تعریف نہ کرتے۔ لیکن انھوں نے کتاب کیا لکھی ہے کتاب کا جلوس نکالا ہے۔ ایک صاحب ذوق انشا پرداز کو اس قسم کی سوقیانہ حرکات سے گریز واجب ہے۔ دیباچہ نویسوں کی خدمت میں ہماری مودبانہ عرض ہے کہ شملہ بہ مقدار علم رکھیں۔ چلو بھر پانی میں گز بھر نہ اچھل پڑیں۔ عالم وہی ہے جس کا انداز عمر بھر طالب علمانہ رہے بڑے بڑے دعوے کرنا اور ایک دفعہ قلم سے جو نکل جائے اسے نظر ثانی تک کا محتاج نہ سمجھنا، جہالت کی نشانیاں ہیں۔ لنکن کا قول ہے:۔

"تم کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لیے اور سب لوگوں کو تھوڑے عرصے کے لیے دھوکہ دے سکتے ہو، لیکن سب لوگوں کو ہمیشہ کے لیے بے وقوف نہیں بنا سکتے"۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اس مضمون سے نصحائے زیر بحث کو تکلیف بھی ہوگی اور شرم بھی آئے گی۔ اگر شرم تکلیف پر غالب آگئی تو ہم ان کے جواب سے محروم رہ جائیں گے اگر تکلیف شرم پر غالب آئی تو حیدر آباد، گلبرگہ، بھوپال، علی گڑھ اور لکھنؤ میں "لائیو قلم دان" کی آوازیں بلند ہوں گی۔ گو ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ آئیں بائیں شائیں کرنے کی بجائے چپ رہنا بہتر ہے۔ آگے آپ خود سوچ لیجیے۔ ہماری طرف سے خواہ آپ سب حضرات کسی مرکزی مقام پر سر جوڑ کر کوئی جوف مرتب کر لیجیے خواہ الگ الگ زور آزمائی کیجیے۔ ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔ ہم تو بلکہ آپ سے "جھانپلزم" تک کے متوقع ہیں۔

باقی رہا "نمیجہ تبسم" یہ کتاب ایک قابل احترام بزرگ کی تصویر سے شروع ہوتی ہے اور ایک ایسے مضمون پر ختم ہوتی ہے جو بازاری فواحشات سے پُر ہے۔ اس مضمون میں تمکین صاحب نے جس کوک شاستری ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے آثار نہ صرف ان کے باقی مضامین میں بلکہ ہندوستان کے اکثر مزاحیہ نگاروں کی تحریرات میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر تنقید لکھنا ان کے تعفن کو زیادہ پھیلانا ہے۔

انار کلی مخلص صاحب اور ہم نیاز مند

دسمبر ۱۹۳۲ء کے رسالہ ساقی میں انارکلی پر ایک نظر کے عنوان سے "ایک مخلص کے قلم سے" ایک مضمون چھپا ہے جو بوجوہ بے حد دل چسپ ہے۔ مضمون کا رقبہ ساڑھے آٹھ صفحے ہے لیکن فی مربع میل کے حساب سے خیالات کی تقدار سائبریا کی آبادی سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے مضمون نگار صاحب ہر سطر میں گز گز بھر اچھلے پڑتے ہیں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وسعتِ ظرف چلو بھر سے بھی زیادہ نہیں اور چلو بھی ایسا جس میں وہ خود باوجود اپنی تنگ خیالی کے ڈوب مرنے سے قاصر ہیں۔

تو پہلے بدگوئی کو لیجیے کیونکہ مخلص صاحب نے اپنا زورِ قلم زیادہ تر اسی صنفِ ادب یعنی بے ادبی پر صرف کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انارکلی پڑھنے کے ساتھ ہی مخلص صاحب کو بدہضمی کی شکایت لاحق ہو گئی۔ چنانچہ ان کی بے قرار روح سے طرح طرح کی کریہہ آوازیں نکلتی ہیں کہتے ہیں انارکلی اٹھ کر بڑی مایوسی ہوئی انارکلی کی موت سے زیادہ خود تاج صاحب کی حالت پر رونا آتا ہے۔ وہ بجائے مبارک باد کے کسی اور بات کے مستحق ہیں۔ دل سے چاہتے ہیں کہ تاج صاحب آئندہ اس سفاکی سے لٹریچر کا خون نہ بہائیں تو بڑا احسان ہوگا۔ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ وہ آئندہ ذمہ دار لٹریچر سے کوئی واسطہ نہ رکھیں انارکلی کا ڈرامہ تو اتنا بھی بھاری بھر کم نہیں جو پڑھے لکھے تو درکنار معمولی واقفیت کے آدمی کو ہی بھائے یا اس پر رعب ڈال سکے اور تاج صاحب کو نصیحت کرتے ہیں۔ کہ وہ فوراً اسے دریابرد کر دیں۔

جب ہم نے یہ الفاظ پڑھے تو خیال آیا دہلی کسی دوست کو تار بھیجیں کہ کسی حکیم سے مشورہ کر کے مخلص صاحب کو ایک ہلکا سا جلاب دے دیں تاکہ یہ قرقر رفع ہو جائے اور انہیں ہدایت کریں کہ آئندہ برس دو برس تک کے لیے اپنی ادبی غذا ذرا ہلکی رکھیں مثلاً مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی نظمیں یا مولانا حسن نظامی کا روزنامچہ بس ایسی ایسی

چیزیں پڑھ لیا کریں کیونکہ ان کا معدہ اس سے زیادہ کا تحمل نہیں ہو سکتا جب ذرا بڑے ہو جائیں گے اور کچھ تھوڑا بہت پڑھ لیں گے تو پھر ٹریجڈی کی تنقید سے بھی شوق فرمائیں۔ فی الحال انہیں مولانا راشد الخیری کے ناول ہی پڑھتے رہنا چاہیئے کیونکہ وہ ایسے ہی ضعیف دماغ کے لیے لکھے گئے ہیں۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے ہونہار بچوں کی دل شکنی ہو گی اب تو ماشاء اللہ ایسے بال بھی سکولوں کالجوں میں داخل ہونے لگے ہیں، اور مذکر مونث کے جھگڑوں کو چھوڑ کر نقد و تبصرہ کے میدان میں زور آزمائی کرنے لگے ہیں ذرا غور سے دیکھیں شاید کوئی کام کی بات کہنا سیکھ گئے ہوں۔ یوں تو اہل زبان کی بیت جھڑ شروع ہو کر ختم بھی ہونے کو آ گئی اور زبان کو ملکتے ماکتے ادیب کی دم میں ہندہ بھی باندھ گئے لیکن شاید پھر بھی کسی ہونہار مضمون نگار کی دم میں کہیں کوئی چکنا پات لگا ہو اس خیال سے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جہاں مخلص صاحب نے دس بارہ جگہ اپنی جہالت اور بد اخلاقی کا ثبوت دیا ہے وہاں بیس تیس جگہ اپنی علیت بھی ضرور جتائی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا ساختہ علم ان کی بے ساختہ علم ان کی بے ساختہ جہالت سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ لیکن مخلص صاحب کی ان خصوصیات کا تلاش کرنا کچھ آسان کام نہیں ان کے مضمون میں خیالات کے موتی بکھرے پڑے ہیں زور بکھرے پڑے موتی پر نہیں۔ دراصل موتی کی جگہ ایک اور لفظ سوچا تھا لیکن استعمال اسلیے نہیں کیا کہ "اہل زبان" کہیں گے محاورہ غلط ہو گیا) ان موتیوں کو چن کر یکجا کرنے کے لیے اس مضمون کی بھول بھلیاں میں کئی دفعہ گھومنا پڑتا ہے کیونکہ ژولیدہ بیانی ایسے نقادوں کی خاص صفت ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

"انار کلی..... تین ایکٹ کا ایک موضوعی (سب جیکٹو) ڈراما ہے۔ جسے غیر اصطلاحی زبان میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس تصنیف میں تاج صاحب آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ من انی بد مادت سنائیں گے"۔

اب اس فقرے کو کوئی کیا کرے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دہلی جا کر مخلص صاحب کے دارالمطالعہ کے دروازے پر دستک دیں اور دھڑکتے دل سے جو جھانکیں تو ہم استاد پوچھیں کہ حضرت سب جیکٹو ڈراما دہلی کا محاورہ ہے یا لکھنو کا؟ کیونکہ الفاظ گو انگریزی ہیں لیکن انگریزی فن تنقید اس اصطلاح سے محض ناواقف ہے اس اصطلاح کی جو تصریح غیر اصطلاحی زبان

اما کبھی مخلص صاحب اور ہم نیاز مند

میں مخلص صاحب نے ہم جاہلوں کے فائدے کے لیے کر رکھی ہے اس سے بھی نہ کھلا کہ یہ دریافت کیا ہے کب ہوئی اور اسکا کولمبس کون ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلص صاحب نے تنکا پور کے سفر کے دوران میں وہیلر کے بکسٹال سے ڈرامہ پر کوئی کتاب لے کر پڑھ لی تھی جس سے ان کی جہالت میں اس قدر خوش گوار اضافہ ہوا کہ وہ اسے علم سمجھنے لگ گئے۔

غالباً اسی کتاب مصنفہ لال بجھکڑ سے مخلص صاحب پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ :-

"(انار کلی) ادب کی بنیادی تقسیم یعنی شاعری، فکشن اور ڈرامے کی آخری صنف کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے بلکہ یہ کہیے کہ اس صنف میں بھی کتاب نسبتاً" ایک ایسی اہم شق یعنی ٹریجڈی کی حامل ہے جسے انسان کی دکھیاری زندگی کا نمونہ عبرت ہونا چاہیے"۔

مطلب صرف اتنا ہے کہ انار کلی ایک ٹریجڈی ہے لیکن یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ اس کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اور اس اظہارِ علم کے شوق میں بات ایسی فرسودہ اور بے معنی کہی کہ عطار گویہ کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ خود اسی مضمون میں مخلص صاحب نے بڑے مربیانہ انداز میں حضرت آزاد مرحوم کی ایک تحریر کا نمونہ پیش کیا ہے اور اسے خوب سراہا ہے ہم علامہ مخلص صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ادب کی بنیادی تقسیم وہی ہے جسے انھوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں یوں بھگار کر پیش کیا ہے تو وہ خود ہی بتائیں کہ آزاد کی یہ تحریر کس صنف میں شامل ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا "سی پارہ دل" کس خانے میں ڈالیے گا۔ غالب کے "اردوئے معلیٰ" کو کیا قرار دیجیے گا۔ آپ کی پڑھی ہوئی کتابوں میں سے یہی مثالیں کافی ہیں۔

آگے چل کر اعتراف کرتے ہیں کہ انار کلی کا یہ قصہ خود تاج صاحب کے قول کے مطابق ایک بے بنیاد چیز ہے لیکن اعتراض فرماتے ہیں کہ مصنف ڈرامہ نے سرِ فہرست ہی میں انار کلی کا یہ واقعہ ١٥٩٩ء کا لکھا ہے جب کہ اکبر کی عمر چھپن سال تھی اور متحیر ہوتے ہیں کہ اکبر جس نے جوانی میں ہیمو بقال کو نہ مارا وہ چھپن برس کی عمر میں انار کلی کو کیونکر مروا سکتا ہے اس استدلال سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی کہ قصہ بے بنیاد ہے پھر نہ معلوم مخلص صاحب تاج صاحب کی تائید کر رہے ہیں یا تردید؟

برسبیل تذکرہ ہندوستان کے تمام ججوں کو یہ بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھپن برس کا شخص قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پیش ہو تو اس سے پہلی بات یہ پوچھیں کہ

کیوں بے تو نے جوانی میں ہیموں بقال کو مارا تھا؟ اگر جواب نفی میں ہو تو اسے رہا کر دیں۔

ان مثالوں سے میں قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مخلص صاحب کے مضمون کو سمجھنے کے لیے باقاعدہ اغلاط نامہ مرتب کر کے ساتھ رکھنا پڑا کئی فقروں کی نحوی ترکیب کرنی پڑی۔ کئی پیراگرافوں کو از سرِ نو ترتیب دینا پڑا۔ کئی فقروں کے معنے جوتشیوں سے پوچھنے پڑے، اور اس دوڑ دھوپ کے بعد مطلب یہ وصول ہوا کہ مخلص صاحب کو بہ قول ان کے "خلش" تین چیزوں سے ہوتی ہے۔

(۱) فرماتے ہیں! اکبر کے متعلق میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کھلم کھلا کہتا ہوں (مضمون کا رقبہ اسی قسم کی تکرار کا ممنونِ احسان ہے) کہ انار کلی لکھ کر آپ نے اس کی با عظمت سیرت تباہ کی ہے"!

اس سلسلے میں مخلص صاحب نے پھر اپنی پریشان خیالی کے کئی ثبوت دیے ہیں۔ ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ "اکبر بادشاہ کے نام کے ساتھ ہی جو تصویر ہندوستان کے بچے بچے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے وہ آپ کے اکبر والے کردار سے بالکل نہیں ملتی" جس کا مطلب ہم یہ سمجھے کہ مخلص صاحب کے نزدیک ڈرامے کا اکبر تاریخ کے اکبر سے مختلف ہے (اس کا جواب مختصراً تو یہ ہو سکتا تھا کہ ڈرامہ نویس یا کوئی بھی انشا پرداز اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کرے اگر وہ تاریخ کے مطابق نہ ہو تو آپ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو مورخ کی حیثیت سے کوئی درجہ نہ ملنا چاہیے۔ اس کی انشا پردازی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ علم ادب کی تاریخ میں آپ کو کئی مثالیں اس اس بات کی ملیں گی کہ ایک ہی تاریخی شخص کو مختلف انشا پردازوں نے متباین اندازوں میں پیش کیا لیکن ان کی ادبی حیثیت کو اس تباین سے کوئی صدمہ نہ پہنچا لیکن یہ اصول ذرا مطالعے کے بعد سمجھ میں آتا ہے)

پھر آپ فرماتے ہیں:-

"ڈرامہ نگار کی تعریف یہی ہے کہ وہ جیتی جاگتی ہستیاں پیدا کرے اور کبھی بھی کوئی بات ان میں خلاف فطرت نہ ہو"

مخلص صاحب یہ دوسری بات کہنے کے ساتھ ہی بھول بھی گئے۔ یہ فقرہ جو کہیں سے سن پایا تھا جوں کا توں اپنے مضمون میں رکھ دیا لیکن اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس معیا

ہم اکبر کے کیریکٹر کو پرکھ کر دکھاتے اور ثابت کرتے کہ فلاں بات جو اکبر نے کہی یا کی وہ انسانی فطرت کے منافی ہے۔ اور بجز جنات کی امداد کے ظہور میں نہیں آسکتی۔ جب یہاں مخلص صاحب نے خود ہی ہتھیار ڈال دیے تو ہم بھی ان کی جان بخشی کیے دیتے ہیں اور دنیا کو شاہد ٹھہراتے ہیں کہ ہم باوجود نوجوان ہونے کے بیہودوں بقال پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

یہ خلافِ فطرت والی بات مخلص صاحب نے محض رعب گانٹھنے کو کہی تھی اصل مطلب ان کا وہی ہے کہ تاریخ کا اکبر بہت شاندار ہے اور ڈرامے کا اکبر ظالم اور سفاک سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس کے جواب میں ہم مخلص صاحب کی خدمت میں یہی مخلصانہ مشورہ پیش کرتے ہیں کہ وہ دس بارہ سال تک روزانہ انارکلی کی تلاوت فرماتے رہیں۔ ممکن ہے اس کے بعد موٹے موٹے نکات ان پر واضح ہو جائیں۔ اگر اسے پڑھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے اکبر کی یہ تصویر نہیں کھنچتی تو ایک عالی وقار علم دوست روشن دماغ شہنشاہ جو ہر وقت ہندوستان کی عظمت کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور جوان خوابوں کی تعبیر کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایک نوجوان میں جو اس شان دار سلطنت کا ولی عہد ہے کمزوری یا بے راہروی کے ذرا سے آثار بھی پاکر اس قدر بیقرار و پریشان ہو جاتا ہے اور جہاں بانی کی اہم ذمہ داریوں کو اس درجہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے پدرانہ جذبات کا خون کر لینے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مخلص صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ تصویر نہیں کھنچتی تو چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ اگر اب بھی مخلص صاحب کو ڈرامے کا اکبر محض ایک ظالم اور سفاک بادشاہ معلوم ہوتا ہے تو سوائے اس کے ان کا کیا علاج ہے کہ کوئی نیک دل انسان اپنی زندگی ان کی اصلاح کے لیے وقف کر دے خواہ مرتے وقت صرف یہ تسکین اپنے ساتھ لے جائے کہ انما الاعمال بالنیات اگر ادب کا ذوق نہ ہو، استفادے کی قوت نہ ہو، احساسات میں بیداری نہ ہو، دماغ میں روشنی نہ ہو تو مبادیات ڈرامہ کے متعلق کسی سڑی بسی کتاب میں چند فقرے پڑھ لینے سے تنقید کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔

باقی اس قسم کے اعتراضات کہ فلاں باندی کی زبانی مغل اعظم کو صلواتیں سنوائی ہیں۔ فلاں کنیز کی زبانی سلیم کی مٹی پلید کرائی ہے۔ صرف ریختی لکھنے کے لیے مسالہ مہیا کر سکتے ہیں۔ تنقید سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ایسے اعتراضات نہ صرف انتہا درجے کی ادب ناشناسی بلکہ انتہا درجے کی کم فہمی کی دلیل ہیں۔ اکبر اور سلیم تو نہایت معمولی انسان

ہیں اگر آپ بلا تشبیہ کسی پیغمبر کا قصہ بھی لکھیں تو اس میں بھی یہ ذکر ضرور آئے گا کہ فلاں شخص نے ان کو پتھر مارے فلاں نے ان سے یہ بدسلوکی کی۔ حتیٰ کہ بعض نے انھیں سولی پر لٹکا دیا اور پھر بھی ان کا مضحکہ اڑاتے رہے پھر اگر آپ پر کوئی اعتراض کرے کہ آپ نے معاذ اللہ فلاں پیغمبر کی توہین کرائی تو بتایئے کہ آپ اس شخص کی ذہانت کے رُخ انور پر ایک تھپڑ رسید کرنے کے سوا اور کیا کریں گے۔ مخلص صاحب کی خدمت میں صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آپ ایک آدھ کتاب ابھی اور پڑھ لیجئے پھر تنقید نگاری بھی کر لیجئے گا آپ کا ہاتھ کس نے روکا ہے؟ لیکن اس نقادی میں بھی آپ کو کیا مزہ آئے گا۔ کہ ہر مضمون کے بعد آپ خود ہی موضوعِ تنقید بن جائیں۔

ایک بات پڑھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور رونا بھی آیا۔ فرماتے ہیں۔

"میں ابھی تو یہ کہتا ہوں کہ انارکلی کا ظاہری حسن دیکھ کر بڑی امیدیں بندھی تھیں۔ سوچتا تھا کہ واقعی یہ ڈرامہ مغلئی شان و تجمل کا ایک سہانا خواب ہوگا جس میں شاہانِ سلف کے سفر و حضر کے حسین مناظر اس طرح دکھائے گئے ہوں گے کہ بسنت رُت ہے۔ اکبر بادشاہ سیر و شکار میں ہیں۔ سینکڑوں ہاتھی گھوڑے اور ہزاروں خلقِ خدا کا لاؤ لشکر رکاب میں ہے گویا جنگل میں منگل ہو رہا ہے ...... دو آشیانہ منزل (جھروکہ) سینے لگا لگا دیوانِ خانہ عام ہے جس کے صحن کے بیچوں بیچ (۴۰) گز طولانی ستون پر آکاش دیا رات میں دور دور روشنی پہنچاتا ہے ...... اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو اکبری سلطنت کا حسین بازو ہی نورتن سے ایسا سج دیتے کہ سب دیکھنے کے دیکھتے رہ جاتے اگر اس کا اہتمام بھی تاج صاحب کے بس کا نہ تھا تو جشنِ نوروز کے بیان میں کم سے کم مینا بازار کی پیاری تصویر کھینچ کے یہ رنگ تو دکھایا ہوتا کہ ملک تدبر کے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی خداداد طبیعت سے اس میں کیا ندرت پیدا کی ...... یعنی یہی کہ بادشاہ امرا کو سلطنت کا رکن رکین جانتا تھا۔ اور انہیں اس طرح شیر و شکر رکھنا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کی سنگت سے مزہ بڑھے ...... بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود دار امرا ہم

کھٹک بھی جاتے۔ جہاں یہ صورت پیش آئی اور بادشاہ نے رشتہ ناطہ
کر کے دونوں گھرانوں کو ایک کیا۔"

اب تو قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ مخلص صاحب ڈرامے کو سمجھنے کے کس حد تک اہل ہیں۔ تاج صاحب تو ڈرامہ انار کلی کا لکھ رہے ہیں کہ اس کنیز کا حسرت ناک انجام کیونکر ہوا لیکن مخلص صاحب کو یہی افسوس رہا کہ تاج صاحب نے ان کو چالیس گز طولانی ستون کیوں نہیں دکھایا۔ مخلص صاحب کو خود بھی اس بات کی نامعقولیت سوجھ گئی چنانچہ دبی دبی زبان میں فرماتے ہیں:۔

"اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو......"

برخوردار بات یہی ہے کہ اس کا موقع نہ تھا۔ سمجھ میں تو آپ کی آگیا لیکن ہٹ آپ کی ویسی ہی قائم ہے پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ اچھا یہ نہیں تو نورتن ہی دکھا دیا ہوتا۔ اچھا یہ نہیں تو مینا بازار ہی دکھا دیا ہوتا۔ اب اس بچپنے کا کیا علاج۔ مطلب مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب انار کلی کا قصہ تو تھوڑی دیر کو بند کر دیتے اور مخلص صاحب کو ایک ایسا سین دکھا دیتے جس میں اکبر امراء کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے کراتے نظر آتے کوئی تاج صاحب سے پوچھتا کہ حضرت یہ کیا دخل در معقولات ہے تو تاج صاحب جواب میں کہتے کہ قصہ انار کلی کا سہی لیکن اکبر کی خوبیاں اس تفصیل سے دکھانا بہرحال ثواب کا کام ہے۔ اگر ڈرامہ اسی اصول پر لکھا جاتا ہے تو تاج صاحب کو چاہیے کہ اگلے ایڈیشن میں ایک آدھ سین غرناطہ کا بھی دکھا دیں کیونکہ اس کی داستان بھی تو آخر اسلامی کلچر کی علمبردار ہے۔ اگر غرناطہ بہت دور ہے تو کم از کم تزک بابری کا ذکر ضرور ہونا چاہیے کیونکہ بابر بہرحال اکبر کا رشتہ دار تھا۔ اور بقول مخلص صاحب وہ "بزرگ رفتگاں" میں سے تھا۔ آخر میں ایک سین آل انڈیا مغل کانفرنس کا بھی دکھا دیا جائے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے تو اور بھی چار چاند لگ جائیں گے۔ مخلص صاحب کو تاریخی کلچر کا درد تو بہت ہے لیکن ان کا مذاق اگریکلچر سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔

(۲) دوسرا اعتراض مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب کی قوت مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ علامت کے طور پر آپ نے تاج صاحب کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔

"موسم بہار کی ایک دوپہر ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹے کے قریب وقت ہو چکا ہے"۔ اور اعتراض فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں بے ضرورت لفاظی ہے۔

فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا۔

"بہار کا موسم سہ پہر کا وقت ہے"

دوپہر کے لفظ سے جو دھوپ کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ظہر کی نماز کے ذکر سے جو ایک مسلمان گھرانے کی مصروفیات کی طرف ضمناً اشارہ ہے وہ آپ نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ وہ چیز جسے انگریزی میں ATMOSPHERE کہتے ہیں (یا معنی کسی پڑھے لکھے سے پوچھئے۔ ڈکشنری میں دیکھیے تو شاید واضح طور پر سمجھ میں نہ آئیں) اس کی طرف سے تو مخلص صاحب آپ نے دماغ کے دروازے بالکل بند کر رکھے ہیں۔

مگر جس فقرے کو وہ بقول خود ابھار کے دکھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے:

"ستونوں اور محرابوں کے سایے طویل ہونے شروع ہو گئے۔"

فرماتے ہیں "یہ ایک کھلی بات ہے کہ زوال کے بعد سایہ ڈھلنے لگتا ہے اور ظہر کی نماز ایک حد تک سایہ طویل ہونے پر ہی ہوتی ہے لیکن آپ کا جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ نماز ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ہو جائے تو سائے طویل ہوتے شروع ہوتے ہیں۔"

سایہ ڈھلنے اور سائے طویل ہونے میں جو فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جس ستون پر دھوپ پڑ رہی ہے جب اس کا سایہ ستون کی لمبائی سے بھی بڑھ جائے تو اس کو سایے کا طویل ہونا کہتے ہیں دھوپ کے متعلق جس قدر مشاہدہ آپ کا ثابت ہوتا ہے وہ تو بجز بال سفید کرنے کے اور کسی کام نہ آئے گا۔

(۳) تیسرا اعتراض زبان کے متعلق ہے۔ اعتراض اول تو ایسے فقرے پر ہے کہ "تم غلیل ہو شیخو؟" تو مضائقہ کیا ہے حضور؟" وغیرہ وغیرہ جو شخص اہل زبان "ہو کر بھی یہ نہ سمجھے کہ مخاطب کے نام کو فقرے کے آخر میں رکھ دینے سے فقرے کا تیور کس حد تک بدل جاتا ہے اس کو کوئی غیر اہل زبان بذریعہ تحریر تین سو میل کے فاصلے سے کیا سکھائے اور کس طرح سکھائے اور اہل زبان کو یہ کس طرح بتائے کہ اہل زبان ہونا اور بات ہے زبان دان ہونا اور بات ہے۔ اے کاش کوئی قادر الکلام شخص بلند آواز سے ان فقروں کو مخلص صاحب کے سامنے پڑھے اور مخلص صاحب کے چہرے کا مطالعہ کرتا جائے اور جب آٹھ دس دفعہ پڑھنے کے بعد اسے مخلص صاحب کے چہرے پر انشراح کی کوئی جھلک نظر آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دے تاکہ ہم شکرانے کے دو نفل پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ پرانی وضع کے ہندوستانی کھیلوں کے

عادی ہو چکے ہیں وہ ان کی مصنوعی زبان اور مصنوعی طرزِ تحریر سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس قسم کی جیتی جاگتی زبان انہیں تکلیف دہ طور پر انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ شیکسپیئر نے بھی جب اس طرح کی جدت کی تھی تو لوگ اس پر یونہی معترض ہوئے تھے ادھر ایک بہت بڑے نقاد نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ چھری اور کمبل جیسے الفاظ کو ڈرامے میں استعمال نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ لوگوں کو "خنجر اور ردا" اور اسی صنف کے بلند آہنگ الفاظ کا چسکا پڑ گیا تھا اور جو مصنف اس تصنع سے گریز کرتا تھا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا ہے مخلص صاحب تاریخ ادب سے واقف ہوتے۔ تو عبرت پکڑتے لیکن دامن از کجا آرد کہ جامہ ندارد۔

"بختہ حسن" اور "پھیکا آسمان" وغیرہ کے متعلق مخلص صاحب نے صرف اتنا فرما دیا کہ نئی ترکیبیں ہیں لیکن یہ نہ فرمایا کہ ان میں نقص کیا ہے۔ کوئی اعتراض کرتے تو جواب کی تکلیف بھی گوارا کر لی جاتی۔ فی الحال تو اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ بجا ہے حضور یہ نئی ترکیبیں ہیں، اور ان میں سے بعض مثلاً بختہ حسن صرف مبتدیوں کے لیے نئی ہیں۔

دو محاوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ان کا محل استعمال غلط ہے آخر مخلص صاحب اپنی حرکتوں پر اتر آئے۔ ہم بھی متعجب تھے کہ اہل زبان کی لکھی ہوئی تنقید ہو اور اس ہلدی کی گرہ یعنی "محاورے" کا تذکرہ نہ ہو۔ جس کی بدولت یو پی کے کئی حضرات پنساری بن بیٹھے ہیں۔ تاج صاحب کا فقرہ ہے۔ "دنیا کی تو انار کلی انار کلی کہتے زبان خشک ہوئی جا رہی ہے۔ اور تجھے اتنی توفیق نہیں کہ جھوٹے منہ سے دو بول شکریے ہی کے کہہ دے۔"

مخلص صاحب کہتے ہیں "جھوٹے منہ" کا یہ محل استعمال نہیں یہاں "پھوٹے منہ" چاہیے۔

اگر جناب مخلص صاحب نور اللغات کی ورق گردانی کی زحمت گوارا فرمائیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ جھوٹے منہ کے معنی ہیں۔ ظاہر داری سے اور نمائش سے۔ ڈرامے کا جو فقرہ اوپر نقل کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا تو تیری تعریفیں کر دی ہے اور تجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ ظاہر داری یا نمائش ہی کے طور پر دو بول شکریے کے

کہہ دے۔

"بھوٹے منھ" کے معنی نور اللغات میں یوں لکھے ہیں "(تحقیر سے) عو خراب منھ سے، بھدے منھ بد دلی کے ساتھ۔" توسین میں جو "تحقیر سے" لکھا ہے اس سے مراد ہے کہ یہ محاورہ جس کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے اس کی تحقیر بھی مراد ہوتی ہے گویا مخلص صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ انار کلی کی ماں اس موقع پر ایسا فقرہ کیوں نہیں کہتی جس سے انار کلی کی تحقیر کا پہلو بھی نکلے! یہ اعتراض محاورے کا اعتراض نہیں۔

دوسرا اعتراض "تیجوں دار روزن" پر ہے۔ "تیجہ" کے معنی نور اللغات میں یہ لکھے ہیں "چھوٹی سیخ" "لوہے کی چھوٹی سلاخ"۔ "تیجوں دار روزن" لکھنے سے مصنف کی مراد یہی ہے کہ ایسا روزن جس میں لوہے کی چھوٹی سلاخیں لگی ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے روزن کے متعلق یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر بڑا تھا۔ اگر کسی بہت ہی چھوٹے روزن مثلاً کسی گڑیا کے گھر کے روزن کا ذکر ہو تو ممکن ہے وہاں تیجوں کی بجائے سلائی کا لفظ استعمال کیا جائے اس وقت مخلص صاحب فرمائیں گے کہ سلائی سے تو سرمہ لگایا جاتا ہے۔ خدا کے لیے مخلص صاحب کے کوئی دوست انہیں سمجھائیں۔

باقی الفاظ کے متعلق اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کو شاید معلوم نہ ہو دہلی کے ایک مصنف منشی فیض الدین گزرے ہیں جو لال قلعے کی زبان لکھنے کے لیے مشہور تھے انہی کی ایک کتاب ہے "بزم آخر" پچھلے دنوں نایاب تھی اب چاندنی چوک کی کسی دکان سے ضرور مل جائے گی کبھی شام کو اینڈر ڈیاں کرنے سے فراغت پا کر ادھر سے گزریے تو ایک نسخہ خریدتے جایئے اس میں آپ کو گنگا جل، کپڑا اور گوش پیچ کی گوٹ اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ مل جائیں گے جن پر آپ یوں جاہلانہ معترض ہوئے ہیں۔ جو الفاظ وہاں نہ ملیں ان کے متعلق ابوالفضل کے آئین اکبری کا مطالعہ فرمایئے وہاں مل جائیں گے۔ جو مغلیہ دور امر لکھنے بیٹھتا ہے وہ ایسی مستند کتابوں کو ضرور دیکھ لیتا ہے اے کاش جو لوگ تنقید لکھنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی اتنی تکلیف گوارا کر لیا کریں۔

اب آپ کے پاس صرف ایک ہی جواب رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم نور اللغات کو مستند مانتے ہیں نہ بزم آخر کو اگر یہ واقعہ ہے تو مخلص صاحب کو چاہیے پہلے اہل زبان

آپس میں نپٹ لیں جب خود ان کا ایمان درست ہو جائے تو پھر باقی صوبوں میں بھی تبلیغ شروع کریں۔

تو در درونِ دریچہ کمر دی کہ بر درونِ خانہ آئی

یہ تمام ہست و بود ہے اس تنقید کی قارئین نے دیکھ لیا کہ اس تنقیدی مضمون میں انار کلی کے اصل موضوع کو مخلص صاحب نے چھوا تک نہیں محض ضمنی اور فروعی باتوں ہی میں الجھے رہے خود انار کلی کے کیریکٹر کے متعلق کچھ نہ فرمایا جو ڈرامے کی جان ہے اور جس کے ارد گرد تمام واقعات و کوائف کی تنظیم کی گئی ہے۔ مناظر کی تقسیم کے متعلق کچھ نہ لکھا، واقعات کے تناسب کے متعلق کچھ نہ فرمایا ٹریجڈی کی مختلف کیفیات کے زیر و بم کے بارے میں خاموش رہے۔ اردو ڈرامہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر یہ نہ فرمایا کہ انار کلی کا ڈرامہ کہاں تک رسمی ڈرامے کا ممنون ہے اور کہاں پرانی قیود کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے اس بات پر بحث نہ کی۔ اگر یہ ڈرامہ سٹیج پر دکھایا جائے تو کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ پیشہ ور سٹیج اس کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے اور کیوں؟ کسی اور ٹریجڈی سے مقابلہ نہ کیا۔ یہ نہ ارشاد کیا کہ اردو ڈرامے کی موجودہ حالت کیا ہے اور اس میں انار کلی کس حد تک ترقی یا تنزل کا موجب ہو گا کہا تو یہ کہا کہ اکبر بہت اچھا آدمی تھا۔ سایے دوپہر کے بعد ہی ڈھلنے لگ جاتے ہیں اور ہمارے نیچے نہیں فلانچہ ہوتا ہے اور اپنے زعم میں سمجھ رہے ہوں گے کہ ارسطو کے بعد اگر کسی نے ڈرامے کی تنقید لکھی ہے تو ہمیں نے لکھی ہے۔

اب صرف ایک بات کا ذکر باقی رہ گیا ہے اور چونکہ میں اس بات کو مخفی کیا بہتر بیان کرنا چاہتا ہوں اس لیے ڈر ہے کہ مخلص صاحب کے پلّے شاید نہ پڑے۔ تاج صاحب نے انار کلی کو مس حجاب اسمٰعیل کے نام ڈیڈیکیٹ کیا چغتائی صاحب نے اپنی قلم کاری سے اس ڈرامے کی طباعت کو رونق بخشی۔ تاج صاحب اور مس حجاب اسمٰعیل یا تاج صاحب اور چغتائی صاحب کے باہمی مراسم مخلص صاحب کو معرضِ بحث میں نہ لانے چاہیے تھے۔ مخلص صاحب اور مخلص صاحب کی قماش کے نقادوں کو ذہنی اعتبار سے ابھی بچوں یا کے درجے سے بالاتر ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور ابھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس طرح کا ناشائستہ چرچا ان خود نقاد کے سفلہ پن کی دلیل ہوتا ہے خصوصاً خواتین کا ذکر انہیں اس بے تکلفی سے نہ کرنا چاہیے جس سے شہدے پن کی بو آئے۔۔ یہ

یا کی مخلص صاحب اور ... منہ

یہ مسز حجاب امتیاز کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی انشاپردازی کی وجہ سے اس زمرے میں شامل ہیں جس میں اصطلاحاً مخلص صاحب بھی قدم رکھتے ہیں لیکن مخلص صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہیئے اسے اپنے عدم تربیت کے اظہار کے لیے ایک بہانہ نہ بنا لینا چاہیئے۔

مخلص صاحب کے مضمون کے ساتھ رسالہ ساقی کے ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھ کر چاردانگ عالم میں اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ "مضمون نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے"۔ اور یوں سمجھ سا جائے کہ وہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے لیکن شاہد جیسے تربیت یافتہ نوجوان کو اس امر کا احساس ہونا چاہیئے کہ جس بداخلاقی کی طرف ہم نے آخری پیراگراف میں اشارہ کیا ہے اس کی اشاعت ایک دودمان عالیہ کے سپوت کو نہ کرنی چاہیئے تھی مخلص صاحب کی نقادانہ بدتمیزیوں سے ہم شاہد صاحب کو بری الذمہ سمجھنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن مخلص صاحب کا ذاتی کلچر شاہد صاحب کے دامن پر چند ایسے بدنما دھبے چھوڑ گیا ہے جو بے تعلقی کا ایک نوٹ لکھ دینے سے نہیں دھل سکتے

ہم اس مضمون کے کسی کھسیانے سے جواب کے لیے چشم براہ ہیں خواہ وہ جواب مخلص صاحب لکھیں یا شاہد صاحب یا دونوں کے دونوں میں سے کسی ایک کے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ گمنام یا نامدار، استاد، شاگرد یا ہمنوا۔
